DECEMBER 2024

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

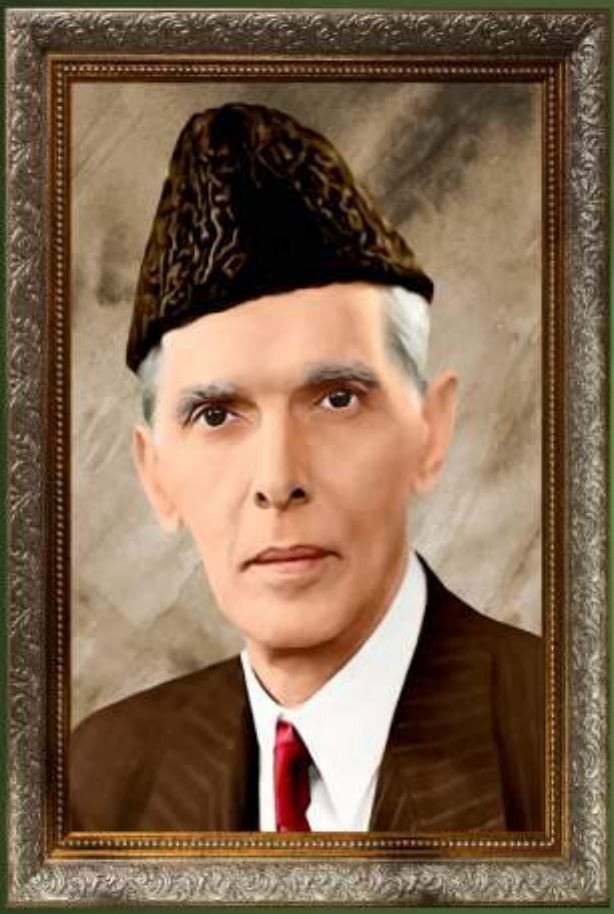

پاسبان ہے ملت کا قائدِ اعظم محمد علی جناح

اوصاف
محمد
خالد علیم

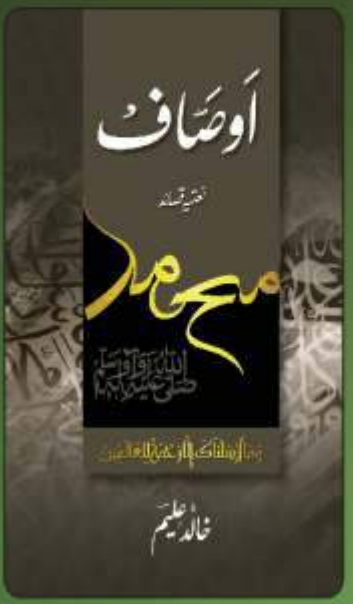

نوید صادق
دورانیہ

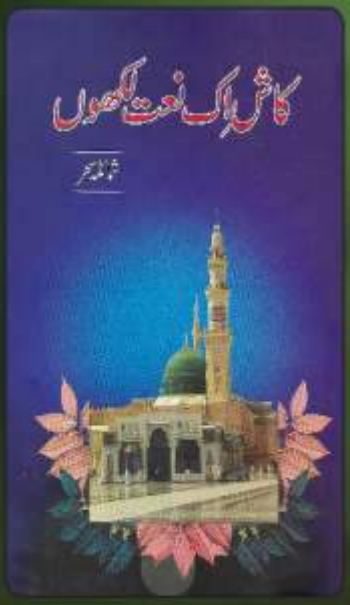

دھوپ چھاؤں

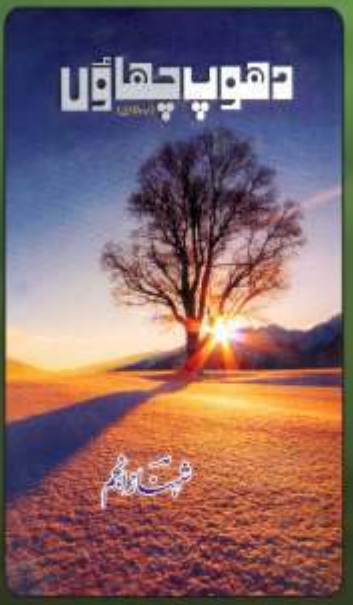

کاش اک نعت لکھوں

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

رات بھر دل کے در و دیوار چمکاتی رہیں
تیرے رخساروں کے پیچھے تمتماتی دوریاں

دل کے دروازے پہ دم دم دستکیں دیتی رہیں
تیری بانہوں میں چھنکتی کھنکھناتی دوریاں

جگنوؤں کا دیس میری آنکھ کو پردیس تھا
چار جانب پر کشا تھیں جھلملاتی دوریاں

گوشِ دل کو شام ہی سے صبح کا پیغام تھیں
قربتوں کی ٹہنیوں پر چہچہاتی دوریاں

چلتے چلتے جان دے دینے پہ اُکساتی رہیں
فاصلوں کے پار، پل پل، ٹمٹماتی دوریاں

آس بن کے گمرہوں کو عمر بھر ڈستی رہیں
پیار کے سندر بنوں میں سرسراتی دوریاں

چار جانب جھاڑیوں میں سسکیاں بھرتی ہوا
چار سو، ویراں سُروں میں گنگناتی دوریاں

چاہتوں کے رنگ کیا، رس تک اڑا کر لے گئیں
موجۂ صرصر کی صورت سنسناتی دوریاں

فصل تو نے بوئی تھی، لیکن اسے کاٹیں گے ہم
دیکھ تو حدِ نظر تک لہلہاتی دوریاں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - دسمبر 2024 - شمارہ نمبر: 12

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: قائداعظم محمد علی جناح

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ	www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلو میٹر زفارما ٹیک بالمقابل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	فیض رسول فیضان	7
2	نعت	ریاض مجید، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی شوکت محمود شوکت، رضا اللہ حیدر، سیدہ روبینہ بخاری	8 تا 14
3	عقیدت	محمد انیس انصاری، احمد جلیل، مرزا آصف رسول خالق آرزو، امجد مرید حیدری	15 تا 20
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ	21
5	مضامین	جلیل عالی، ابدال بیلا، اکرم کنجاہی، فیصل زمان چشتی علی رضا، صدام ساگر، طلحہ غفور، جی ایم چیل نسترن احسن فتیحی، رقیہ اکبر، رانا محمد شاہد، حنا بابر	22 تا 81
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	82 تا 91
7	طنز و مزاح	علی رضا احمد	92 تا 95
8	غزلیں	خالد احمد، خورشید رضوی، آصف ثاقب، انور شعور، جلیل عالی اعجاز کنور راجہ، نثار ترابی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر گلزار بخاری، یعقوب پرواز، شریف ساجد، سید قاسم جلال اقبال سروبہ، فرحت عباس شاہ، راحت سرحدی، شاہین عباس	96 تا 175

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	اکرم ناصر، مسعود احمد، زاہد فخری، منظور ثاقب، ذکی طارق محمد سلیم ساگر، افروز رضوی، عقیل رحمانی، افتخار شاہد انصر حسن، اکرم سحر فارانی، احمد جلیل، رانا سعید دوشی محمد نوید مرزا، رخشندہ نوید، فرح رضوی، ہمایوں پرویز شاہد ابنِ عظیم فاطمی، شاہد ماکلی، شوکت محمود شوکت، اعجاز روشن احمد سبحانی آکاش، عرفان صادق، آفتاب خان، نائلہ راٹھور خالدہ انور، راجہ عبدالقیوم، افتخار شوکت، اظہر کمال صغیر احمد صغیر، اویس الحسن، اورنگزیب حسام حر، وسیم جہران ریاض ندیم نیازی، اصغر علی بلوچ، شبیر نازش، مرزا سکندر بیگ ساگر حضور پوری، فیض رسول فیضان، اکرم جاذب فیصل زمان چشتی، اسلم سحاب ہاشمی، مستحسن جامی حسن پرویز سیڈ، قمر نیاز، شاہ روم خان ولی، بشیر احمد حبیب شاہد فرید، محمد عاصم بخاری، میتھیو محسن، محمد اشفاق بیگ کوکی گل، اویس اکبر، حکیم خان حکیم، رخسانہ سمن اسد رضا سحر، شہاب اللہ شہاب، نعمان محمود، شائستہ رمضان غضنفر مہدی، جیا قریشی، ہنزلہ شاہد، نینا عادل	96 تا 175
9	افسانے	کلیم خارجی، آفتاب محمود شمس، آسناتھ کنول فصیحہ آصف خان، محمد شفیق نور کمال شاہ، ناہید طاہر	176 تا 217
10	مائکرو فکشن	سلمان یوسف سمیجہ، سید محمد آصف مہدی	218 تا 219
11	نظمیں	ریاض مجید، جلیل عالی، سید افسر ساجد، خالد علیم، فیاض تحسین محمد انیس انصاری، منظر اعجاز، طلعت شبیر، محمد نوید مرزا سعدیہ بشیر، نائلہ راٹھور، امجد بابر، دردانہ نوشین خان محمد کلیم، سید انجم معین بلے، ظہور چوہان، انوار انجم ہادیہ بتول، نوید صادق، اعجاز رضوی	220 تا 241

حمد

جو بصد عجز و ادب حمد سرا رہتے ہیں
باغ فردوس میں سرشار سدا رہتے ہیں

یہ بھی ہے مالک و مولا کی عطائے رحمت
جتنے درویش ہیں راضی برضا رہتے ہیں

اُس کی قدرت کے کرشموں کا عجب قصہ ہے
عقل کی حد سے بہرحال ورا رہتے ہیں

ہم فقیروں پہ شہنشہ کی نظر رہتی ہے
ہو کے دُنیا میں بھی دُنیا سے جُدا رہتے ہیں

یار کی یاد سے فرصت ہی نہیں ہے اُس کو
لوگ ناحق ہی قلندر سے خفا رہتے ہیں

نعتِ محبوبِ خدا پڑھتا ہوں سبحان اللہ!
مجھ پہ ابواب عنایات کے وا رہتے ہیں

فلسفہ جن کے لقا کو ہے ترستا رہتا
دیدۂ عشق میں وہ جلوہ نُما رہتے ہیں

جس نگر خالقِ کونین کا پیارا گھر ہے
ایسا کرتے ہیں اُسی شہر میں جا رہتے ہیں

مطمئن ہے دلِ مسکین ، بفضلِ ایزد
لاکھ طوفان زمانے میں بپا رہتے ہیں

بزمِ کثرت میں بھی وحدت کی لگن ہے فیضان
لعل گدڑی میں بھی ہوں، بیش بہا رہتے ہیں

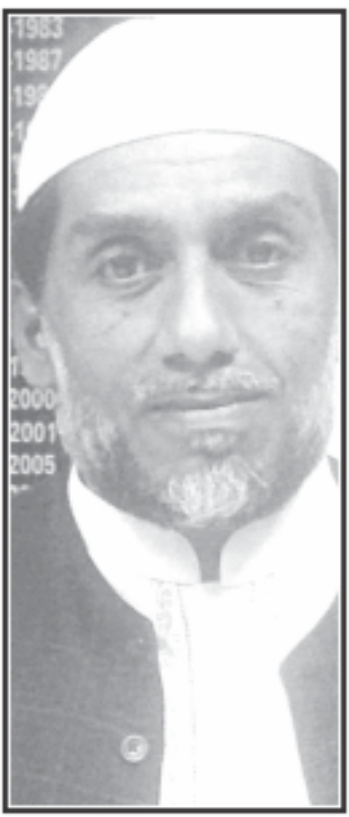

فیض رسول فیضان

نعتؐ

اخلاصِ مستجاب بھی شامل دعا میں ہو
اس طرح مانگ، جیسے ترا دل دعا میں ہو!

ہو جائیں گے قبولیت آمادہ لفظ سب
'جاؤ' کا خیال جو شامل دعا میں ہو

ہر خلیۂ حواس ہو مشغول التماس
غفلت کا شائبہ بھی نہ شامل دعا میں ہو

وہ سُن رہا ہے تیرے تہِ دل کی بات بھی
پل بھر کے واسطے بھی نہ غافل دعا میں ہو

اِس کی بھی مقتضی نہیں شان اُس کریم کی
'پھر مانگ پہلے تُو کسی قابل دعا میں ہو'

ہوتی ہے کیا بغیر وضو بھی کبھی نماز
لفظوں کے ساتھ گریہ بھی شامل دعا میں ہو

سب کی ہتھیلیاں ہوں کُھلیں، دل ہوں گریہ ناک
شامل ہر ایک شاملِ محفل، دعا میں ہو!

پیشِ نگاہ جب ہوں مواجہ کی جالیاں
شامل نہ اشتیاق سے، کیوں دل دعا میں ہو

کیوں کر نہ مستجاب وہ ہوگی ریاض جب
غیبی تجلیات کی جھلمل دعا میں ہو!

ریاض مجید

نعتؐ

رکھوں دل میں محبت در عقیدت
ملے گی مجھ کو آقاؐ کی شفاعت

خدا کا حکم ہے دل سے عبادت
رضا اس کو محمدؐ کی اطاعت

رسولؐ پاک کی یہ ہے ہدایت
نہیں رکھتے کسی سے ہم عداوت

یہ کیسی خوش نصیبی ہے خدایا
ہمیں بخشی محمدؐ کی نبوت

تشخص ہو گیا روشن نبیؐ کا
مثالی ہو گئی ہے اُنؐ کی سیرت

محمدؐ نام ہے میرا عقیدہ
کسی بھی غیر سے رکھوں نہ رغبت

عنایت ہے مجھے یا رب ہمیشہ
وقارِ نعت لفظوں کی فضیلت

دعا ہے ہر گڑی ساعت میں ثاقب
ملے مجھ کو مدینے کی حمایت

آصف ثاقب

نعتؐ

دلوں میں اُسؐ نے بٹھائی غیاب کی صورت
تو بھولتی کسے یومِ حساب کی صورت

زمیں نے دیکھے ہیں آئین و آدمی کیا کیا
مگر وہ ایک ہی سیرت کتاب کی صورت

بسے ہوں جن کی نظر میں وہ نور نور نقوش
وہ دیکھتے ہیں کہاں ماہتاب کی صورت

کیا ہے جب بھی کڑے موسموں اُس اسمؐ کا ورد
ہر اک حصار سے نکلی ہے باب کی صورت

ہٹا کے اُسؐ کی رہِ اعتدال سے خود کو
جہاں نے آپ ہی اپنی خراب کی صورت

کوئی سوال ہو، اُسؐ کو عطا ہوا جو نصاب
اُسی سے نکلے مکمل جواب کی صورت

ہے کون دہر میں آئینۂ حکومتِ خیر
کوئی نہیں ہے رسالت مآب کی صورت

جلیل عالی

نعتؐ

آپ نے رکھی جہاں میں رہبری کی آبرو
یعنی سارے انبیا میں برتری کی آبرو

پرچم انسانیت کی ہیں اڑانیں تا کراں
آپؐ کا حسن عمل ہے بندگی کی آبرو

جینے مرنے کی ابد آثار راہیں کھل گئیں
گمرہوں کو راس آئی، راستی کی آبرو

آپؐ آئے تو جمود بے اثر ہے دم بخود
آپؐ کے آنے سے مہکی تازگی کی آبرو

مسئلہ کوئی نہیں ابہام سے خالی رہا
آپؐ نے رکھی شعوروآگہی کی آبرو

بے زبانوں کو ملا ہے آپؐ سے اذن کلام
آپؐ سے پہلے کہاں تھی ان کہی کی آبرو

آپؐ ہی کے نور سے ہے ضوفشاں سارا جہاں
زرفشاں ہوتی گئی ہے روشنی کی آبرو

ہے دعا کہ اس ہنر میں ہو بسر اب زندگی
مدحت خیرالورائی ہے شاعری کی آبرو

اب ریاض نعتؐ مہکا ہی رہے گا تا ابد
آپؐ نے رکھی ہے کیسی سرخوشی کی آبرو

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

آپؐ کے آنے سے ہر اک، راز پوشیدہ کھلا
کثرتِ اصنام میں، توحید کا نکتہ کھلا

آپؐ کے آنے سے دشمن سب ہوئے شیر و شکر
نفرتیں سب مٹ گئیں اور پیار کا رستہ کھلا

بزمِ ہستی آپؐ ہی کے واسطے یوں سج گئی
ابرِ رحمت، سب جہاں پر ٹوٹ کر برسا، کھلا

پھر کسی نے کی نہ ہرگز پیروی طاغوت کی
قلبِ انسانی پہ حق ایسا کھلا، ایسا کھلا

وہ گدا ہوں، بادشہ ہوں، وہ عدو ہوں یا رفیق
آپؐ کا در، ہر کسی کے واسطے دیکھا، کھلا

آپؐ کی سیرت پہ شاہد ہے کلامِ پاک، سب
ساری خلقت کے لیے ہے آپؐ کا اُسوہ، کھلا

آپؐ کی باتوں میں وہ تاثیر تھی میرے حضورؐ!
موم وہ بھی ہو گیا، جو دشمنِ جاں تھا، کھلا

میری خوش حالی کے سارے بند رستے کھل گئے
نعت کے فیضان سے میں کیا کہوں، کیا کیا کھلا

ہو گیا شوکت مقدر، اپنا بر اوجِ کمال
نعت کا ہر پل جو دیکھا، میں نے دروازہ کھلا

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

دیکھی نہیں اُس حُسنِ جہانگیر سے بہتر
تصویر کوئی طیبہ کی تصویر سے بہتر

پیغام ہمیں دے گئے اصحابِ محمد
ہے سیرت و کردار ہی تقریر سے بہتر

اے کاش مری آنکھیں دکھائیں کبھی ایسا
اک خواب کہ جو خواب ہو تعبیر سے بہتر

چمکا ہے جہاں والوں پہ خورشید منور
اک نور کہ ہے شعلہ و تنویر سے بہتر

احوال مرے بگڑے سنور جائیں گے اک دن
ہے ان کی اطاعت مجھے تدبیر سے بہتر

طیبہ کی گزرگاہ سے ان پلکوں سے چن کر
تحفہ میں رضا لایا ہوں اکسیر سے بہتر

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار

نعتؐ

آپ کے نام پہ قربان دل و جان رہے
نام لیوا ہوں نبی کی، یہی پہچان رہے

میں کہیں بھی رہوں لوٹوں تو وہیں جا پہنچوں
مستقل آپ کے کوچے میں ہی سامان رہے

ذکرِ سرکار کی برکت سے جہاں روشن ہے
آپ گر ہوں نہ جہاں پورا ہی ویران رہے

نامِ سرکار لکھوں، نعت لکھوں، حمد لکھوں
ہاتھ روشن رہیں، روشن یہ قلم دان رہے

ہوں عمل پیرا جو سنت پہ تو آسانی ہو
پرسکوں زیست ہو اور کوئی نہ طوفان رہے

آپ کے بعد نبی آیا نہ آئے گا کوئی
گر مسلمان ہے، کامل یہی ایمان رہے

کاش جاری رہے ہر لحظہ مرے لب پہ درود
اور ارشادِ نبوت کی طرف دھیان رہے

سیدہ روبینہ بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

عقیدت

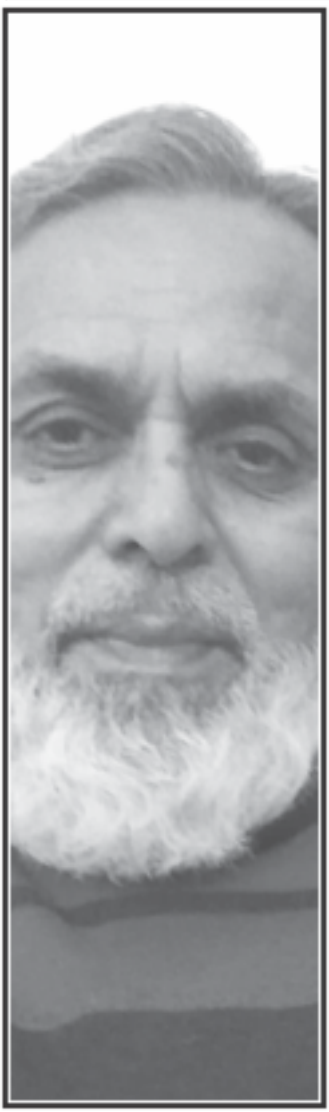

حمد لکھنے کا قرینہ مجھے دے
اپنی توصیف میں جینا مجھے دے

موم کر دے مرا پتھر کا بدن
چشمِ نم دے ، دلِ بینا مجھے دے

اُمتی مجھ کو بنانے والے
عشقِ سرکارؐ مدینہ مجھے دے

تیری رحمت کے جزیروں میں کہیں
جو اُتارے وہ سفینہ مجھے دے

جو چُھپا لیں مری بدصورتیاں
وہ صدف دے ، وہ نگینہ مجھے دے

جو تری سمت رکھے گرمِ سفر
وہی رَستہ ، وہی زینہ مجھے دے

جس میں بھانبڑ ہو ترا جانِ انیس!
وہ سلگتا ہوا سینہ مجھے دے

محمد انیس انصاری

عقیدت

احمد جلیل

مرے رسول سا کوئی کہیں رسول نہیں
کہ جن کا ثانی مصور کو بھی قبول نہیں

بغیر عشقِ نبی کے عبادتیں کیا ہیں؟
بغیر اس کے عبادت تری فضول نہیں؟

حدیثِ عشق کو جتنا بھی مختصر کیجے
طویل پھر بھی رہی ہے، دیا بھی طول نہیں

مرے نبی کی ثناؤں کو ہے دوام جلیل
کسی بھی ذکر کو اب تک ملا یہ طول نہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے ، جاگیں چوکی دار

کوئے رسولؐ

زہے نسیم! کہ ہے تو ہوائے کوئے رسول
مری بھی کر وہاں عرض التجائے کوئے رسول

حریمِ صل علی میں مقیم ہو جاؤں
کہ بے نیازِ جہاں ہے گدائے کوئے رسول

ہے منظر اس سے بڑا کیا مری سعادت کا
ہو کاروانِ حرم اور گدائے کوئے رسول

نہ ڈگمگاؤں کہیں میں نہ لڑکھڑاؤں کہیں
کہ دست گیر ہے میری دعائے کوئے رسول

ہے زمزمہ طلع البدر کا مرا بھی سخن
کہ لفظ لفظ ہے گویا عطائے کوئے رسول

ہمیں ہیں سطوت کبریٰ کے مستحق اب بھی
اگر رہے نہ یہ امت جدائے کوئے رسول

نہ ہوتی عصمت و عفت کسی کی بے پردہ
جو سب نے اوڑھ لی ہوتی ردائے کوئے رسول

جہاں میں وہ کہیں رہ جائے بے نوا کیونکر؟
سجی ہے جس کے لبوں پہ صدائے کوئے رسول

وفائیں دشتِ مراسم کی ظلمتوں میں کہیں
بھٹک نہ جائیں، ہے رہبر ضیائے کوئے رسول

ہے جس تنِ بشریت میں تو اسیر اے جاں!
ہے اس سے اچھی کہیں؟ خاک پائے کوئے رسول

ہے فیض انھی کا الا ان اولیاء اللہ
دلوں کو کرتی ہے بے غم ولائے کوئے رسول

ہے کس کا بخت؟ بریدہ بن الحسیب ایسا
ہے جس کے ہاتھ میں پہلا لوائے کوئے رسول

ہو قیل و قالِ جہاں جب کبھی ملال آور
تو راحتِ دل و جاں ہے ثنائے کوئے رسول

ہمیں تعفّنِ دنیا سے دے پنہ یارب!
دلوں کو رکھے معطر فضائے کوئے رسول

ارم حسیں ہے مگر عشق کی نگاہوں میں
ہزار سایۂ طوبیٰ فدائے کوئے رسول

قسم بہ اشھد ان لا الہ الا اللہ
اذان اہل ولا ہے ندائے کوئے رسول

نہ کیوں مدینہ مدینہ کا ورد ہو لب پہ
ہے سب غموں کا مداوا نوائے کوئے رسول

جمالِ گنبدِ خضرا کے عاشقوں کی نظر
کسی طرف نہیں اٹھتی سوائے کوئے رسول

ہر امتی پہ نظر ہے، انھیں ہے سب کی خبر
نہیں جہان کوئی ماورائے کوئے رسول

ہے خود سے وہ کہ خدا سے کہ ہے وہ خلق کے ساتھ
ہر ایک عہد کا حاصل وفائے کوئے رسول

دل و نگاہ و خرد جس کے ہیں مدینے میں
نہ جا کے بھی وہ نہیں نارسائے کوئے رسول

وہ ضو ہے جس کا علیکم بسنّتی مظہر
وہ ضو ہے سب کے لیے رہنمائے کوئے رسول

ہو دل نگارشِ ختم ارسل محمد میں
جو تن میں جاں ہے رہے جاں برائے کوئے رسول

زباں سے ہو کہ نظر سے کہ ہو عمل میں عیاں
ادائے عشق و ادب ہے ادائے کوئے رسول

سرِ ہجوم بھی جس نے مجھے نہ گرنے دیا
ہے ناتواں کی وہ طاقت، رجائے کوئے رسول

تمام عمر ہو لبیک یا رسول اللہ
سرِ ہجوم ہی کیوں نعرہ ہائے کوئے رسول

اسی کا دل ہے، دل حسبنا کتاب اللہ
کہ جس کے زہد میں ہے اکتفائے کوئے رسول

فقط سخن سے نہیں ہو گا حق ادا اس کا
جو قصہ عشق ہے اور مقتضائے کوئے رسول

ہے شعرِ جامیؒ و حسانؓ جیسے سب کے لیے
ہو یہ سخن بھی سفیرِ صلائے کوئے رسول

تو مانگے اس سے تو مانگ آصف! اس یقین کے ساتھ
کہ ہے وہ مالک و مولیٰ، خدائے کوئے رسول

مرزا آصف رسول

عقیدت

اس محورِ وفا کی وفا کو مرا سلام
اس مخزنِ شفا کی شفا کو مرا سلام

وہ ذات جس کے اسم سے دنیا ہے مستنیر
اس معدنِ ذکا و سخا کو مرا سلام

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''
اس نورِ ابتدا کی بقا کو مرا سلام

جو رحمتِ تمام ہے دنیا کے واسطے
اس پیکرِ حیا کی حیا کو مرا سلام

میرے قلم کو جس نے عطا کی ہے روشنی
اس دلنشیں حبیبِ خدا کو مرا سلام

شامل مرے لہو میں ہوئیں اس کی شفقتیں
اس کی ہر ایک نوری اَدا کو مرا سلام

قاسم خدائے پاک نے اس کو بنا دیا
اس صاحبِ عطا کی عطا کو مرا سلام

مدحت نگار اس کے ہوئے ہر جہان میں
ہر نعت خوان نغمہ سرا کو مرا سلام

کعب و بصیری ہوں کہ کوئی اور نعت گو
ان سب ثنا گروں کی ثنا کو مرا سلام

خالق آرزو

عقیدت

غم گساروں کی خیر ہو آمین
تیرے پیاروں کی خیر ہو آمین

اِک میں اِقرا ہے اِک میں لا تحزن
دونوں غاروں کی خیر ہو آمین

بدر سے کربلا تلک سارے
جاں نثاروں کی خیر ہو آمین

آپؐ کے اہلِ بیتؑ اور اصحابؓ
چاند تاروں کی خیر ہو آمین

امجد مرید حیدری

انتخاب

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

- خالد احمد -

نعمان منظور

رباعیات

دم ساز ہے کون کوئی غم سے پوچھے
دل چیز ہے کیا عشق صنم سے پوچھے
ہم قبلہ نما دینِ محبت کے امام
اسرارِ محبت کوئی ہم سے پوچھے

سایہ نہ قبائے شب میں پنہاں ہوتا
بے پیرہنِ رنگ نمایاں ہوتا
تصویر مصور نہ پہن لیتا اگر
اندیشۂ تصویر میں عریاں ہوتا

رستہ کھا گیا رزق سے آگے کا سفر
غم باز ہوا فسق سے آگے کا سفر
فتنے کے قدم تھک گئے تھے حیرت میں
بوسے نے کیا عشق سے آگے کا سفر

غصہ نہ پئے خوف نہ کھا جائے تو
بندہ نہ سنے خامشی چلانے تو
نیکی کو بھی رنگ بدلتے دیکھو
سچ جھوٹ کے پردے میں کبھی آئے تو

ملتا نہیں جینے کا بہانہ ہم کو
اے زورِ ستم نہ آزمانا ہم کو
ہم کل کی آنکھ میں بغاوت کا خواب
تعبیر میں روئے گا زمانہ ہم کو

معشوق گری ہے دل بری سے آگے
ہے عشق بھی اپنی خودسری سے آگے
دیکھا ہے بار بار آئینۂ شمس
ہے شمس نظر شمس وری سے آگے

دل ریت کی تشنہ آبجو تھوڑی ہے
ساغر کی آنکھ بے وضو تھوڑی ہے
لب بوس ستارے میں ہے شعلے کی لپک
بوسہ کوئی قفل آرزو آرزو تھوڑی ہے

محمد نصیر زندہ

''گلیوں گلیوں'' لازماں کی طرف نکلتا مسافر

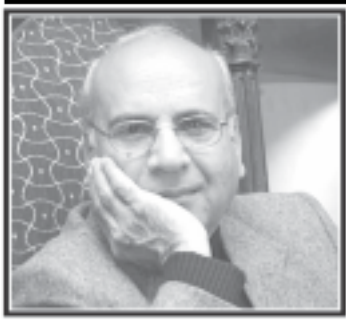

شاہین عباس بہ تمام و کمال ایک اوریجنل شاعر ہے۔ قدرت نے اسے نرول فکر و احساس اور تازگیِ اظہار کے جوہر سے نواز رکھا ہے۔اس کی شعری دنیا قاری کو پوری طرح اپنے نواح میں لے جاتی ہے۔ تخلیقی زرخیزی بھی اس کی نمایاں پہچان ہے۔وفورِ سخن اس کے شعور فن کو کہیں معذور نہیں ہونے دیتا۔ وہ ایک افلاطونی عشقیہ سرشاری اور کائناتی و ماورائی حیرت و استعجاب میں جیتا ہے۔اسے روز لازمانی علاقوں کی سیر دیکھنی ہوتی ہے مگر وہ ان علاقوں کی طرف جانے والی شاہراہ پکڑنے کے لیے گلیوں گلیوں نکلتا اور مائیکرو کو میکرو سے ملانے کی راہیں تلاشتہ ہے۔اسی تلاش میں کسی کھنڈر ہوتی قدیم حویلی کی دیوار میں خود بخود ایک دروازہ کھلتا ہے اور اس میں داخل ہوتے ہی اسے پر لگ جاتے ہیں اور پھر ماضی، حال اور فردا ایک بے کرانی میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ شعری واردات کی گمبھیرتا اپنی جگہ، مگر اس کی ساری شاعری میں بیان کی ایک دلپذیر موجودگی اس کے بہترین اشعار کا انتخاب دشوار بنا دیتی ہے۔

اس کی غزلوں کے مجموعے ''گلیوں گلیوں'' سے ایک طائرانہ سی نگاہ میں آجانے والے چند اشعار دیکھیے:

سر پر سے آسماں جو اتارا پھر ایک دن
ہم نے خدا کے ساتھ گزارا پھر ایک دن

روک ہوا کی بھی نہ تھی روک خدا کی بھی نہ تھی
ہم ترے اتنا پاس تھے خواب کے خواب لے اڑے

یہ ایک بہانہ تھا ملاقات کا سب سے
میں خواب تھا اور خاک کی رفتار سے گزرا

جلیل عالی

کہہ دیجیے یہ ایک ہی غم ہے اور اس کا ہے
اب ایک ایک غم کی وضاحت کرے گا کون

.....

ہر آنے والا اسی طرح سے تجھے چاہے
مری بنائی ہوئی یہ فضا خراب نہ ہو

ازل ابد میں ٹھنی ہے سو میں نکلتا ہوں
مری کڑی سے ترا سلسلہ خراب نہ ہو

میں اپنی شرط پہ آیا تھا اس خرابے میں
سو میرے ساتھ کوئی دوسرا خراب نہ ہو

.....

آدمی نقش رہ سکا ہی نہیں
داغ ہے اور مٹانا بنتا ہے

.....

جس سے سر مرا افلاک سے ٹکرایا تھا
خاک پر پاؤں پڑا تھا اسی دوران مرا

.....

جہاں بنتی نہ تھی تیری تمنا
وہاں میرا تماشا بن رہا ہے

.....

تم ابتدا کی طرف تھے سو ابتدا کی تھی
ہم انتہا کی طرف ہیں سو انتہا کریں گے

.....

اب وقت کو مارتا ہوا میں
تاریخ میں سے گزر رہا ہوں

.....

اس کی گلی بنی نہیں ہم سے مگر یہ کیا
دو چار گلیاں شہر زیادہ ہی بن گیا

.....

لوگ ہی لوگ آڑے جاتے ہیں گلیوں گلیوں
ہم نے کچھ نقشے اچھالے تھے بیابانوں میں

کچھ گمانوں کی سیر تو کر لی
میں گنہگار ہو گیا تو کیا

.....

کوئی مجھ کو آب سمجھے ہے کوئی سمجھے ہے آگ
میرے آگے آگے چلتا ہے دھواں ایسا کوئی

.....

تمھیں کو ہم بسر کرتے تھے اور دن ماپتے تھے
ہمارا وقت اچھا تھا گھڑی ہوتی نہیں تھی

کہو تو گفتگو ستواؤں تم کو ان دنوں کی
ہمارے درمیاں جب بات بھی ہوتی نہیں تھی

ستارے رکھتے رکھتے معذرت کی آسماں سے
کہ ہم سے اور اب خانہ پُری ہوتی نہیں تھی

تعلق یوں پڑا رہتا تھا جو چاہے اٹھا لے
کوئی قیمت بھی اس زنجیر کی ہوتی نہیں تھی

یہاں عجلت میں اک طوفان آیا
سمندر کی بھی تیاری نہیں تھی

.....

ایک دو حرف اور چپ رہ جاؤ
تب تک آواز ہم بنا لیں گے

.....

آخری بار اس نے آنکھیں بند کیں
پھر جو اندر رہ گیا وہ رہ گیا

.....

یہ جو دروازہ ہے بیکار میں کب کھلتا ہے
کچھ نہ کچھ شہر میں ہو جاتا ہے جب کھلتا ہے

☆☆☆☆☆

سیّدنا ہاشم

عبد مناف کے جس بیٹے کا نام عمرو تھا وہی ہاشم کے نام سے مشہور ہو گیا۔

یوں مشہور ہونے کی وجہ یہ بنی کہ جب ان کے سر پہ خدا کے گھر آئے مہمانوں کی تواضع کے لیے پیٹ بھر کے کھانا کھلانے اور جی بھر کے پانی پلانے کی ذمہ داری آ پڑی تو انھوں نے عجب شان دلبری سے اسے نبھایا۔

عام حالات میں تو کبھی ایسی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں مشکل نہ آئی مگر ایک بار مکہ کے قرب و جوار میں قحط پڑ گیا۔ خشک سالی ایسی آئی کہ صحرا میں بسنے والے بوند بوند کو ترس گئے۔

لوگوں کی زبانیں نکل آئیں۔

پینے کو ایک گھونٹ پانی نہ ملتا۔

دُور قریب ہر جگہ کے کنویں خشک ہو گئے۔

جانوروں کی ہڈیاں نکل آئیں۔

لوگوں کے پیٹ پچک گئے،

گال دھنس گئے۔

اوپر سے حج کا موسم سر پہ آ گیا۔

عرب کے صحراؤں سے پیاسی مرجھائی اونٹنیوں کے سوار خدا کے گھر کے متوالے مکہ کی طرف سفر کرنے کا سوچنے لگے۔

اناج ناپید ہو گیا۔

عبد مناف کے بیٹے ''عمرو'' پہ تمام تر حاجیوں کو کھلانے پلانے کی ذمہ داری تھی۔ اس نے گھوڑے نکالے، اونٹ لیے، عرب کے ریگزاروں کو روندتا بھوکا پیاسا دھوپ بھرے آسمان نیچے وہ شام کے سرسبز علاقوں میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے اناج خریدا، لپوایا، پکوایا۔ پھر پکی پکائی روٹیاں اونٹوں پہ لاد کے حج کے دِن عرفہ سے پہلے پہلے مکہ آ گیا۔ شام سے پکوا کے لائی ہوئی روٹیوں کے انبار اتارے۔

صحت مند اونٹنیوں کو ذبح کر کے دیگیں چڑھا دیں۔

گوشت اور شوربے سے بھری دیگوں میں لائی ہوئی پکی روٹیوں کو توڑ توڑ کے ڈال دیا۔ چورا چورا کر کے، پھر مٹی اور لکڑی کے بنے پیالوں میں بھر بھر کے زائرین کو کھلا دیا۔

ابدال بیلا

وہ اپنی نوعیت کا پہلا لذیذ ترین کھانا تھا اور تھا
بھی قحط کے دنوں میں۔ جب لوگ اناج کے
دانے دانے کو ترسے ہوئے تھے۔ لوگوں
نے پیش کیے ہوئے لذیذ گوشت کے
شوربے میں چُورا چُورا ہوئی روٹیوں والے
کھانے کا نام ثرید رکھ دیا اور روٹی کو چُورا
چُورا کر کے کھلانے والے عمرو کو ہاشم کا
خطاب دے دیا۔ اس لیے کہ ہاشم کا لفظ وہ
چُورا چُورا کرنے والے کے لیے استعمال
کرتے تھے۔

شاعروں نے ہاشم کی مدح سرائی میں
شاعری شروع کر دی۔
عبداللہ بن الزلوی کے کہے اشعار یوں تھے

''عمرو کا مرتبہ کتنا بلند تھا
جس نے اپنی قوم کے لیے روٹیاں توڑ کے
ثرید تیار کر لی
اُن دنوں جب
مکہ کے لوگ قحط سے پچکے ہوئے تھے۔''

اس کے چچیرے بھائی وہب بن عبد قصی
نے بھی شاعری کے پیرائے میں ہاشم کی
مدح سرائی کی۔

''ہاشم نے وہ بڑا بوجھ اٹھا لیا
جسے اٹھانے
برداشت کرنے
اور سر پہ لاد کے سرخرو ہونے کی آرزو سے بھی
ہر شریف قوی آدمی سہمے بیٹھا تھا۔
دُور شام کے علاقے سے
وہ بوریوں میں اناج سے مہکی ہوئی ایسی
روٹیاں پکوا کے لایا
جن کی خوشبو کا ہر خالی پیٹ شائق ہوتا ہے
کیسی وسعت اور فراخ دلی سے
ساری روٹیاں توڑ توڑ کے اس نے
مکہ والوں کی ضیافت کی
فربہ گوشت کی قاشوں سے لبالب
ہر آدمی نے
لکڑی کے ان بھرے پیالوں پہ ہاتھ مارے
جو خوشبو اور ذائقے سے بھرے کناروں سے
چھلک رہے تھے۔''

مدح سرائی جہاں ممدوح اور ممدوح کے
چاہنے والوں کے دلوں کی دھڑکن تیز کرتی
ہے وہیں پہ حاسدوں کے دل پہ بجلی کی
کڑک بن کے گرتی ہے۔ حسد دل کی ایسی
بیماری ہے جو دوسرے کا رخ روشن دیکھ کے
اپنا نشیمن جلانے پہ تل جاتی ہے۔ ہاشم کی
مدح سرائی سے جہاں کچھ غیروں کے دلوں
کو کچوکے آنے لگے، وہیں اس کے اپنے
سگے جڑواں بھائی عبد شمس کے بیٹے امیہ کا
دل آگ سے بھر گیا۔
امیہ کہنے کو ہاشم کا سگا بھتیجا تھا مگر اپنے من
میں عذاب پال کے بیٹھ گیا۔
پہلے پہلے اس نے اکا دُکا آدمی سے اپنے
دل کی جلن کہی۔ پھر احساس کمتری میں ڈوبا
ہوا سر عام لوگوں میں کہتا پھرنے لگا، بڑا آیا
چاچا ہاشم بنا پھرتا ہے۔ چار روٹیاں کیا کھلا
دیں، سخی داتا ہو گیا۔
ہم کیا کم ہیں۔

ہم نہیں کھلاتے لوگوں کو۔
ہمارے پاس بھی بہتیرے اونٹ ہیں۔
پیسے کی کمی نہیں ہمیں،
ہمارے پاس بھی بہت سونا چاندی ہے۔
کیسے مان لوں وہ ہم قبائل قریش میں سب سے معزز ہے۔
میں اس سے زیادہ اس رتبے کے لائق ہوں۔
پتہ نہیں اُس کو پتہ تھا، یا نہیں، بہرحال لوگ جانتے تھے کہ امیہ کا باپ عبدشمس، ہاشم کا جڑواں بھائی تھا۔ دونوں جڑواں بھائی جس لمحے پیدا ہوئے تو دونوں عجیب انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ کہنے کو دونوں کے سالم نوزائیدہ جسم علیحدہ تھے مگر ہاشم کے داہنے پیر کا انگوٹھا عبدشمس کے سر کے تالو پہ چپکا ہوا تھا۔
جیسے پیدا ہوتے سے ہاشم نے پاؤں مار کے عبدشمس کے سر کو جھکا دیا۔
دونوں جڑواں بھائی پیدا ہوئے تو دونوں کی ہیئت کچھ ایسی تھی جیسے انگریزی کے دو ہندسے چھ اور نو باہم ملے ہوئے ہوں۔ ہاشم کے پاؤں اور عبدشمس کے سر کو علیحدہ کرنے کے لیے مکہ کے ایک پُرانے جراح کو چھری کے استعمال سے تھوڑا سا خون بہانا پڑا۔
دونوں بھائی علیحدہ تو ہو گئے مگر مکہ کے گھروں میں کئی دنوں تک خون کی بہی ان چند بوندوں کے حوالے سے ذکر ہوتا رہا۔ کچھ ہنسی مذاق میں کہنے لگے۔
ان جڑواں بھائیوں کی اولادوں میں ضرور خون بہے گا۔
خون بہنے کی تو نوبت اس وقت تک نہ آئی۔
بہرحال امیہ بن عبدشمس کا اپنے چچا ہاشم کی فوقیت کو تسلیم نہ کرنے سے خون ضرور سیاہ ہو گیا۔
اس نے شور مچا دیا۔
میں نہیں مانتا ہاشم کو بڑا۔
کوئی بڑا آئے اور ہم میں فیصلہ کرے۔
عربوں میں اپنی انا کی تسکین کے لیے اس طرح سرِعام دوسرے کو بڑا نہ ماننا اور خود کو منوانے کی آرزو کرنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس طرح کے چیلنج میں ہار جیت کا فیصلہ لازمی ہوا کرتا تھا۔ یہ کبھی نہ ہوا تھا کہ کوئی خود دوسرے کی فوقیت کو چیلنج کرے اور کوئی فیصلہ نہ ہو۔
مفاخرہ ہو گیا۔
مفاخرت میں بھی کچھ اصول تھے۔ ایک فریق دوسرے کو چیلنج کرتا دُوسرا نہ مانتا، دونوں ثالثی کے لیے کسی تیسرے فرد کو مقرر کر دیتے۔ ثالث لوگوں کی بھیڑ میں پنڈال کے بیچ پنچائیت لگا کے بیٹھ جاتا۔ چیلنج کرنے والا جا کے ثالث سے سوال کرتا کہ ہم میں کون غالب ہے، کون بڑا ہے؟
ثالث دونوں سے باری باری ان کے قبیلے کے افراد، اونٹوں، مال اسباب، بیویوں، بچوں کی بابت پوچھتا جاتا۔ زبان کی بلاغت، سلاست، فصاحت اور شرینی پہ غور کرتا۔ عوام الناس، مسافروں اور ضرورت مندوں کی مدد کے قصے سنے جاتے۔ ہر اہم

چیز ریکارڈ میں لائی جاتی۔ سر عام پنڈال میں سوال جواب ہوتے۔ لوگ سوالوں اور جوابوں کو سانس روک کے سنتے اور منہ کھول کے ان پہ داد دیتے۔

بیچ بستی کے کچہری جم جاتی۔

منٹوں میں فیصلہ ہو جاتا۔

ہاشم کو مفاخرت کے لئے امیہ بن عبد شمس نے چیلنج کیا تو اس نے بھتیجے کو کہا،

شرم کرو۔

بھتیجا تو شرم کے گھونگٹ اٹھا کے آیا کھڑا تھا۔

بھنڈ ہو گیا۔

آخر ہاشم نے امیہ سے حلف لیا کہ ثالث کا فیصلہ مانو گے؟

وہ بولا، مانوں گا۔

ہاشم نے کہا، جو ہارے وہ سیاہ آنکھوں والی سو نئی پچاس اونٹنیاں ذبح کر کے بستی والوں کو کھلائے گا۔

امیہ بولا منظور ہے، تم اپنی اونٹنیوں پہ نشان لگا دو۔

ہاشم کہنے لگا، نشان تو میں ہی گاڑوں گا، تمھاری اونٹنیوں پہ چھری پھیرنے سے پہلے بھتیجے،

مگر ایک شرط اور بھی ہے۔

امیہ بولا، کون سی چاچا؟

ہاشم کہنے لگا، جو ہار گیا، وہ اس بستی میں نہیں رہے گا۔

دس سال کے لیے اپنا منہ کالا کر کے دُور جا کے بسے گا۔

بول جائے گا؟

جائے گا وہ جو ہارے گا۔

ہاں یہی کہتا ہوں۔

مجھے منظور ہے، تو سامان باندھنا شروع کر دے چاچا، امیہ بولا۔

تیرا سامان تو بندھ چکا ہے بھتیجے، اب ثالث کا فیصلہ سن۔

دونوں چچا، بھتیجے کان لگا کے ثالث کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب تھے۔

ثالث نے فیصلہ سنا دیا۔

بولا۔

ہاشم کی فوقیت مُسلم ہے۔

امیہ حسد کا شکار ہوا۔ ہار گیا۔ اب وہ مانی ہوئی شرطوں کو پورا کرے۔ لوگوں کے انبوہ میں ہاشم کے طرف دار غل غپاڑہ مچانے لگے۔ نعرے لگنے لگے۔ امیہ کی لائی ہوئی کالی آنکھوں والی قیمتی پچاس اونٹنیاں، ہاشم کے نوکروں نے جا پکڑیں۔ ہاشم چھری نکال کے اس کی کاٹ پتھر سے رگڑ کے تیز کرنے لگا۔ امیہ سر جھکا کے ایک طرف نکل گیا۔

وہ گھر نہیں گیا۔

ایک اونٹ پہ بیٹھا اور شام کی طرف نکل گیا۔

دس سال مکہ سے دُور ویرانوں میں اس نے زندگی بسر کی، وہیں مر گیا۔

امیہ کی اولاد نے ہاشم اور ہاشم کے خانوادے کے ساتھ دشمنی کے بیج اپنے سینے میں خود ہی بو لیے۔ امیہ کا بیٹا حرب ہوا۔ حرب کا بیٹا ابوسفیان۔ ابوسفیان سے آگے اس کا بیٹا امیر معاویہ تھا، اور امیر

معاویہ کا بیٹا یزید۔
نسل در نسل امیہ کی اولاد نے بنو ہاشم سے
دشمنی لی،
اسے پالا،
اپنا خون جلایا،
حسد سے اپنی روحوں کو بھسم کیا،
اپنے سینوں میں بوئی بانس کی کونپلوں کی
فصلیں اگائیں اور کاٹیں۔
ہاشم خوش رنگ، خوبرو، قد آور مضبوط جوان تھا۔
اوپر سے اپنے قبیلے کا سردار،
خانہ کعبہ کا متولی۔
بات کرنے میں فصیح۔
خاموش دیکھنے میں حسیں۔
اپنے وقت کا کامیاب تاجر۔
اونٹوں بھرے قافلوں پہ گھنٹیاں بجاتا میلوں
لمبا اس کا کاروان تجارت مکہ کے صحراؤں
سے نکل کا شام کا رُخ کرتا تو ساری بستی کی
عورتیں بچے اور بوڑھے دُور تک اس کے
قافلے کو دیکھنے کی چاہ میں قدم قدم چلتے
آتے۔ مہینوں کی مسافت کے بعد لدا بھرا
اس کا قافلہ واپس پلٹتا تو مکہ کے گھروں میں
خوشیوں کا سیلاب آ جاتا۔ عورتیں اپنے شیر
خواروں کو چھاتیوں سے چمٹائے بھاگم
بھاگ اس کے کارواں کے سواگت کے
لیے آ کھڑی ہوتیں۔ بچے کھیل کود روک
دیتے۔ اس کے آئے قافلے کی طرف
بھاگنے لگتے۔ بوڑھے اپنی سوٹیاں ٹیک کے
کھڑے اس کے اونٹوں کو خوش آمدید کہتے۔
مکہ کے گھر گھر کا مال و اسباب اس کے
کاروان تجارت سے وابستہ تھا۔ اس کے
کارواں سے یمن کے شہد، ہندوستان کے
مصالحوں، شام کے عطریات اور ایران کے
ریشمی لمس کی خوشبو سے مکہ کی ساری وادی
کھلکھلا جاتی۔
لبالب مہک جاتی۔
شام کی طرف کا سفر ہاشم کے باپ عبد
مناف نے شروع کیا تھا۔
ہاشم نے گرمیوں میں شام اور رُوم کی طرف
کے مغربی ٹھنڈے علاقوں کا سفر تو جاری رکھا۔
ساتھ سردیوں میں یمن کی طرف کے سفر
کے اجازت نامے بھی حاصل کر لیے۔ چند
ایک تجارتی سفروں کی کامیابی سے ہی وہ
عرب قبائل میں مزید ممتاز اور امیر آدمی
بن گیا۔
ابھی اس کی عمر پینتالیس سال ہی تھی کہ وہ
ایک سفر پہ شام کی طرف چل پڑا۔
راہ میں یثرب آ گیا۔
انہیں خدا جانے پتہ تھا یا نہیں کہ یہی سرزمین
ان کے اس عظیم الشان پڑپوتے کے پڑاؤ
کی جگہ بننی ہے جہاں سے ساری کائنات
میں رحمتوں کے بادل امنڈنے ہیں۔ شاید
اسی لئے خدا کو کچھ اور منظور تھا۔
یثرب کو تو خدا نے بسانا تھا۔
سجانا تھا۔
ابتداء سیّدنا ہاشم کو وہاں روک کے کر دی گئی۔

☆☆☆☆☆

''شہرِ آرزو'' کی نیرنگیاں

ادبی تخلیقات میں روایت بلاشبہ اساسی کردار کی حامل ہوتی ہے مگر معاصر تنقید نگار کو غور ضرور کرنا چاہیے کہ روایت کیا ہے اور مجموعی روایت کیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور اُن کے پس منظر میں شعرا کی طبع آزمائی، تازہ تر فکریات سامنے لاتی ہے۔ آج کا تازہ واقعہ یا کوئی بیان کل باسی کہلائے گا۔ یہ روایت بھی عجیب چیز ہے جو ایسے تجربات کو بھی سمیٹے ہوئے ہوتی ہے جنھوں نے صنفِ غزل کی تہذیب اور وقار کو فنا کرنے میں اپنا پورا کردار ادا کیا ہوتا ہے۔ خالق آرزو موجودہ دور کے شاعر ہیں اور اُن کی غزل معاصر عہد کے رویوں کی عکاس ہے جو آنے والے وقت میں مجموعی روایت کا حصہ ہو گی۔ اِس لیے کہ تحریکات اُٹھتی ہیں، رجحانات سامنے آتے ہیں اور پھر ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غالب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہم غالب کی عظمت اور اُس کی روایت شکنی کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ اُس کے افکار کی جدت و ندرت اور اظہار کے سانچوں کی تازہ کاری سے متعلق بھی یقین رکھتے ہیں۔ اُس نے روایت سے پہلو بچا کر چلنے کی بنیاد فراہم کر دی۔ ہم غور کریں تو کیا شاعری اُسی نہج کو چلی آ رہی ہے یا اب اُس سے دور چلی گئی ہے؟ غالب کے بعد بھی کتنے تجربات سامنے آئے۔ غزل کے تاریخی ارتقا میں کچھ نے ذہنوں کو گرفت میں لیا۔ کچھ اذہان اُس پر مطمئن نہیں ہوئے اور نئے راستوں کی تلاش شروع کر دی۔ ہر شاعر کی تمناؤں، امیدوں، خوشیوں،

اکرم کنجاہی

چاہتوں، خوابوں اور خیالوں کا مرکز ایک ''شہرِ آرزو'' ہوتا ہے۔ جس میں نشاطِ وصل کی بہار آفرینیاں بھی ہوتی ہیں اور دردِ فراق کی خزاں رسیدگیاں بھی۔ خالق کے شہرِ آرزو میں شکستِ خواب کی کرچیاں بھی بکھری ہوئی ہیں اور دیدۂ خوش خواب کے سنہری سپنوں کی تعبیریں بھی جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کا شہرِ آرزو نارسائی میں اُداسی کا گداز بھی لیے ہوئے ہے اور سفیرِ صبحِ درخشاں بھی ہے۔ اُن کا شہرِ آرزو بے تعبیر خوابوں کی کہانی بھی ہے اور دشتِ تشنہ لبی کی مثال بھی۔ اُن کا شہرِ آرزو گردو پیش کی سفاک حقیقتوں کا ترجمان بھی ہے اور مدینۂ کرب و بلا بھی۔ اُن کے شہرِ آرزو میں مِلی رفاقتوں سے تنفر بھی ہے اور دل کی جھیل پر رقصاں کنول سے وارفتگی و شیفتگی کا اظہار بھی۔ خالق کے شہرِ آرزو میں موت و حیات کی کشاکش بھی ہے اور زندگی کی بے ثباتی کا احساس بھی نمایاں ہے۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بے حال ہوا جاتا ہوں
میرے مولا مری قسمت کا ستارا ہے کہاں

اُس کی خوشبو کو لے اُڑی تھی ہوا
کیوں مرے آس پاس پھر بھی ہے

سفیرِ صبحِ درخشاں ظہور تک آئے
کہ اُس کا جلوہ محبت کے طور تک آئے

ہمیں بھی ساقیِ مے خانہ پیار مل جائے
ہماری تشنہ لبی بھی سرور تک آئے

اُس نے پوچھا کہ آرزو کیا ہے؟
بس تمہارا ہی دھیان ہے بھائی

اک طرف اپنے مدینے کو بچانا ہے مجھے
کیا کروں ایک طرف کرب و بلا کھینچتی ہے

کب تلک پھول سنبھالے گا یہ خوشبو اپنی
دیکھیں کس لمحے اِسے بادِ صبا کھینچتی ہے

خواب بُنے تھے جو بھی میں نے آرزو اب بھی خواب ہیں وہ
جب اُن کی تعبیر نہیں تو کیوں اُن میں کھو جاتا ہوں

.....

ادب اور سماج کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل میں سماج سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ادب بھی سماج اور معاشرت کی بہتر تعمیر و تشکیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ وہ افراد کی جذبات کی تطہیر اور تعمیری احساسات کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ نہ صرف معاشرے کے رستے ہوئے زخموں کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ اُن کی چارہ سازی میں مدد کرتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب آئینہ دار ہی نہیں چارہ گر بھی ہے۔ وہ زندگی کی مختلف جہات پر نظر رکھتا ہے اور تہذیب و اقدار کو افرادِ اقوم کی

سوچوں کا حصہ بناتا ہے۔ وہ مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے اور نامساعد حالات میں زندہ رہنے کے ڈھنگ سے آشنا کرتا ہے۔ غزل اپنی معنویت کے اعتبار سے بڑی لچک دار صنفِ شاعری ہے۔ غزل کے ظاہر یعنی ساخت کے حوالے سے جو تجربات ہوئے وہ دم توڑ چکے ہیں۔ البتہ اِس کے باطن یعنی فکر و معنویت کے حوالے سے شعرا نے اسے وسعتوں سے آشنا کیا ہے۔ بات احساسِ ذمے داری کی بھی ہے کہ شاعر معاشرے کا کتنا کارآمد شخص ہے۔ خالق آرزو سے میرا دیرینہ محبت بھرا تعلق ہے۔ اُن سے اکثر زندگی اور اُس کے متعلقات پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا مجھے اُن کے فہم و ادراک کی گہرائی اور وسعت پر کوئی شک نہیں۔ وہ معاشرتی بگاڑ، اخلاقی زوال اور ملک کی پس ماندگی پر فکر مند رہنے والے انسان ہیں۔ اُن کی غزل بھی محض محبت کے سطحی جذبات کی عکاس نہیں بلکہ اُس میں معاشرتی اور سماجی سلجھاؤ کے لیے دردمند دل کی فکر مندی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے کئی ثانی مصارع ایسے ہیں جو اپنی آزاد حیثیت میں قول دانش محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً:

لہجے کی چاندنی کو خنجر نہ ہونے دینا
آنکھیں عزیز رکھنا پتھر نہ ہونے دینا

میلی رفاقتوں کو چادر نہ ہونے دینا
لفظوں کی کھیتیوں کو بنجر نہ ہونے دینا

.....

کہتے ہیں تلوار کے گھاؤ بھر جاتے ہیں مگر زبان اور لہجے سے لگائے گئے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ انسان کو اپنا لہجہ نرم رکھنا چاہیے اور الفاظ کا چناؤ سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ ہمارے گردوپیش میں ایسے ایسے سانحات پیش آتے ہیں، ہماری نظر سے گزرتے ہیں کہ جنھیں دیکھ کر انسان کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ ایسے میں ضبط و تحمل سے کام لینا ہی عقل و شعور کا تقاضا ہے۔ ہمیں خود بھی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے لفظوں میں ہمارے دل کی دردمندی کا اظہار ہو تاکہ سننے والے پر ہماری گفتگو کے مثبت اثرات مرتب ہوں۔ خالق آرزو مزید کہتے ہیں کہ زندگی دکھ اور سکھ کی دھوپ چھاؤں کا نام ہے لہٰذا خوشی اور مسرت کے لمحات میں درد و غم کی ساعتوں کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عمرِ رواں کو غم کا پیکر نہ ہونے دینا
آنکھیں عزیز رکھنا پتھر نہ ہونے دینا

تم مجھ کو زہر دینا لیکن محبتوں سے
لہجے کی چاندنی کو خنجر نہ ہونے دینا

سیراب کرتے رہنا دل کے لہو سے اِس کو
لفظوں کی کھیتیوں کو بنجر نہ ہونے دینا

تم لاکھ ٹوٹ جانا پر ہجر کی شبوں میں
میلی رفاقتوں کو چادر نہ ہونے دینا

اِن سکھ کے موسموں پر کم کم یقین رکھنا
دل کو کبھی دکھوں سے باہر نہ ہونے دینا

.....

منافقت سے بہارِ جاں میں یہ باغبانی نہیں ہے آساں
مگر تم اپنا لہو پلا کر خلوص کے گُل کھلائے رکھنا

نہ ہرگز تفرقے میں تم پڑو بس ایک ہو جاؤ
یہی اللہ کے فرماں، آیتِ قراں میں آئے ہیں

.....

جب بھی ہم غزل گوئی میں جمالیاتی رنگ کی بات کرتے ہیں تو شعری تمثال کاری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ غزل ہو یا نظم تمثال کاری ایک ایسا شاعرانہ وصف ہے جس سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے رجحانات وقتی طور پر سر اٹھاتے ہیں مگر استعارہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ ہم تمثال کاری کو دیگر آرائشی عناصر کی طرح زیرِ بحث نہیں لا سکتے۔ کم از کم جمالیاتی اظہار میں، تمثال روح و رواں کی طرح ہوتی ہے۔ محبوب کی سراپا نگاری سے منظر کشی تک شاعر کو ایک اچھا تمثال گر ہونا چاہیے۔ خالق آرزو نے بھی کئی اشعار میں کہیں تشبیہ اور کہیں استعارے سے تمثال پیدا کی ہے جس سے نہ صرف محبوب کے حسن و جمال میں نکھار پیدا ہوا ہے بلکہ وہ لذت انگیز ہو اہے اور قارئین اِس سے حظ اٹھائیں گے۔ اُن کی تمثالیں گویا لفظی تصویریں ہیں۔ ایک مرئی تصور ہے جو کلام کے مطالعے سے ابھرتا ہے۔ ہر شاعر کی طرح اُنہوں نے تمثالوں کا محض تصور پیش نہیں کیا بلکہ اپنے تجربے اور احساس کو تمثال کا روپ دیا ہے۔ تمثالیں اگرچہ انسانی فطرت اور مشاہدات کے قریب ہوتی ہیں لیکن ایک عام انسان زندگی کی ہنگامہ پروی میں اُن پر غور نہیں کرتا جب کہ شاعر نے ایسے ہی تجربات اور مشاہدات کے لیے خود کو وقف کیا ہوتا ہے۔ ''عشرِ آرزو'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں شاعر نے بڑی مہارت سے محبوب کے حسن کو مناظرِ فطرت قمر، صبا، گلاب، سحاب، نکہت، کنول، ستارے سے تشبیہ دے کر جمال آفرینی کی ہے۔ جمالیات کا سفر کہیں رکتا نہیں۔ اِس کی کوئی حد بندی نہیں بلکہ یہ ظاہر سے باطن کا سفر ہے۔ آرزو بہار کے کھلتے پھولوں پر بات ختم نہیں کرتے بلکہ اُس سے آگے پھر محبوب کے شوخ لبوں کا ذکر کرتے ہیں:

میں کیا کروں گا یہ کھلتے ہوئے بہار کے پھول
میں تیرے شوخ لبوں کے گلاب دیکھوں گا

لکھوں میں رشکِ قمر یا تجھے گلاب لکھوں
صبا مثال لکھوں یا تجھے سحاب لکھوں

عیاں ہے نکہتِ گُل تیری سب اداؤں میں
یہ میرا فرض ہے تجھ پر میں انتساب لکھوں

تم اک کنول ہو مرے دل کی جھیل پر رقصاں
چلو تو میں تری پائل کا بھی حساب لکھوں

.....

محفل اک آسماں پہ ستاروں کی لگ گئی
اب ہو سکے گا مجھ کو بھی دیدار یار کیا

.....

''شہرِ آرزو'' کے خالق، اِس اعتبار سے حالی کے مکتبِ فکر کے قریب ہیں کہ اُنہوں نے شاید ہی کہیں تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہو۔ اُن کی غزل نہ تو جمالیاتی عنصر سے محروم ہے اور نہ ہی اُس نے عظیم ترین کلاسیکی موضوع یعنی محبت کی نفی کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کلاسیکی غزل سے لے کر جدید غزل تک کوئی بھی عہد اِس موضوع سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ اِس غلط تصور کی وجہ یہ بنی تھی کہ بعض ترقی پسندوں اور جدت پسندوں نے جمالیاتی اور رومانی رنگ کو اپنے ہاں کم کم جگہ دی۔ خالق آرزو کی غزل ہو یا نظم وہ اظہارِ ذات اور ذاتی کرب کی شاعرانہ پیش کش سے محروم نہیں ہے۔ اُن کے ہاں لاشعوری کیفیات، وارداتِ قلبی کی صورت میں غالب ہیں۔ اُن کے جمالیاتی تجربات غزل کی روایت کا خوب صورت حصہ ہیں۔ اِس طرح اُن کے ہاں غزلیت، شعریت اور تاثر کی کمی نہیں۔ خالق کو اِس بات کا احساس ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں جمالیاتی قدر ایک سماجی قدر کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ مزید برآں میلان اور محبت کا جذبہ بالکل فطری ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا تو یہ کہنا ہے کہ:

''اہلِ فن نے غزل کے جو اسالیب اور اصول متعین کیے ہیں وہ عشقیہ شاعری ہی کو پیشِ نظر رکھ کر منضبط کیے گئے ہیں اور اُن میں سے ایک یہ ہے کہ غزل کی اشعار میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہو''

''شہرِ آرزو'' کے خالق نے بہت حد تک مضمون، مواد اور اسلوب کو قائم رکھا ہے جو ہمیں پیش روؤں کے ہاں ملتا ہے۔ نارسائی، نایافت، دوری و مہجوری، محبوب کی ستم شعاری، تغافل، اضطراب و بے قراری، انتظار، صبر و ضبط یہ سب مضامین اُن کے کلام میں ملتے ہیں۔ مشرق کی عشقیہ شاعری کا اہم ترین موضوع ہجر و فراق کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارا زیادہ تر غزلیہ سرمایہ اِسی موضوع سے متعلق ہے کیوں کہ نشاطِ وصل کی نسبت وچھوڑے کے لاتعداد تلازمات ہیں۔ ہمارے ممدوح کے ہاں بھی اِس موضوع پر بہترین اشعار ملتے ہیں۔ اُن کی کئی غزلیات کے تمام اشعار اِسی موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں جدائی، محبوب کی یادوں میں ڈھل جاتی ہے۔

جنھیں وہ عزیز رکھتے ہیں۔ دل میں بسائے اور سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے کہیں کہیں بے رخی کا شکوہ ضرور کیا ہے کہ یہ محبّ کے لیے قضا سے کم نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کی ہستی کا دامن تار تار ہو گیا ہے جسے وہ تنہا سی نہیں سکتے۔ آرزو کی نظر میں محبت کھیل ہے اور نہ ہی چھوڑا عام سی بات بلکہ یہ زہرِ قاتل ہے جسے محبّ کو نہ چاہتے ہوئے بھی پینا پڑتا ہے مگر آرزو نے بار بار نہ تو بے وفائی کا اعادہ کیا ہے اور نہ ہی طعن و تشنیع سے کام لیا ہے۔ صرف نگاہِ یار کی کرم فرمائی کی تمنا کی ہے:

ہمیں وفا کا صلہ ملا یہ، ہمارے سر پر قضا کھڑی ہے
تمہاری خاطر کہیں گے ہنس کر، فراق کی یہ سزا کڑی ہے

.....

جدائی زہرِ قاتل ہے جسے میں پی نہیں سکتا
دریدہ دامنِ ہستی میں تنہا سی نہیں سکتا

جہاں والے سمجھتے ہیں تو سمجھیں کھیل الفت کو
مری اپنی طبیعت میں میں تم بن جی نہیں سکتا

.....

بے چین پھر رہا ہوں میں اُس کے فراق میں
بیتابیٔ طلب جو اِدھر ہے ، اُدھر تو ہو

.....

دل سے محو یاد اُن کی لمحہ بھر نہیں ہوتی
ہجر کی کہانی ہے مختصر نہیں ہوتی

.....

ہجر کی تپتی دھوپ میں چلنا، سائے سے گھبرا جانا
کس کی یاد ستاتی ہے کیوں ادھ مویا ہو جاتا ہوں

.....

اہم بات یہ ہے کہ اِس جذبے میں آرزو کے ہاں شیفتگی اور وارفتگی ہے۔ اُنھوں نے محبوب کو بے پردہ نہیں کیا۔ مسلم معاشرے کی ایک تہذیب ہے جو جنسی جذبات کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ ظفر اقبال کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

اوروں کے روز و شب سجاتا ہے رات دن
میری بھی کوئی شام سہانی بنائے جا

.....

عشق و محبت کا تعلق انسان کی داخلی کیفیت سے ہے۔ جس کے اظہار کے لیے آرزو نے غیر مانوس اور اجنبی الفاظ سے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔ نرم و کومل، سادہ اور رواں لفظیات سے کام لیا ہے۔ جہاں جہاں اُنھوں نے طویل بحور میں اظہار کیا ہے، وہاں اشعار کے صوتی آہنگ نے غزل کے حسن اور رعنائی میں اضافہ کیا ہے۔ بہر حال آرزو کے اشعار میں بے خودی اور فریفتگی پر کچھ اشعار کا حوالہ ضرور دوں گا:

تھاما جو اُس نے ہاتھ تو ایسا لگا مجھے
جیسے کہ ڈوبتے کو کنارہ ہوا نصیب

.....

یہ آرزو ہے مروں بھی تو تیرے کوچے میں
میں اس سے پہلے کہ مر جاؤں، اک کتاب لکھوں

یہ عشق جس کے سہارے کمال تک پہنچے
اسی کو پانا تو جھوٹی انا کو کھونا ہے

.....

کرنا ہر سانس اُس کے نام مگر
پھر وہ سانسیں شمار مت کرنا

.....

یہ آرزو میں مری زندگی میں ہر لمحے
تجھی کو سوچوں گا تیرے ہی خواب دیکھوں گا

.....

جو تیرے در سے اٹھائی ہے مٹھی بھر میں نے
وہ خاک ہی سہی میرے لیے تو سونا ہے

.....

غزل سے متعلق دو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ایک یہ کہ عمومی طور پر اسے عشقیہ شاعری کی ترجمان صنف کے طور پر سمجھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ نئی یا جدید غزل حدیثِ دل اور دلبری کی عکاس نہیں رہی۔ یہ دونوں باتیں افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ غزل میں مضامین اور اسالیب کے اعتبار سے اتنا تنوع آچکا ہے جو صرف غزل ہی کا حصہ ہے۔ آرزو کا ایک سادہ سا شعر ملاحظہ کیجیے اور پھر اُس کی معنویت اور سچائی پر غور کیجیے:

یا تو بے حس ہے یا ہے دیوانہ
آج کے دور میں جو ہنستا ہے

.....

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ بے حد سنجیدگی اور متانت کا متقاضی ہے۔ زیست کرنا ایک مشکل عمل بن گیا ہے۔ زندگی کے مسائل، مصائب، دکھ اور تکالیف دیکھ کر انسان مسکرانا بھول گیا ہے۔ ایسے میں شاعر کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہنسنے والا بے حس ہے یا پھر دیوانہ! جس معاشرے میں عزت و توقیر کا معیار شرافت ونجابت کے بجائے روپیہ پیسہ بن جائے وہاں اخلاقی اقدار دم توڑ جاتی ہیں۔ آرزو کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے کہ انسان پیسے کے لیے کیا کچھ کر گزرتا ہے:

شہنائی کی قید نہیں ہے نہ ہے سرتال کی شرط
رقص پہ مائل کر دیتی ہے سکوں کی جھنکار میاں

.....

یہ حقیقت ہے کہ بدلتے ہوئے ماحول اور بڑھتے ہوئی سیاسی وسماجی مسائل میں غزل نے بھی خود کو بدلا ہے۔ عہدِ حالی کے بعد غزل کا اسلوب کوئی بھی رہا ہو کیسا بھی رہا ہو مگر غزل اپنے سیاسی اور سماجی ماحول کے تابع رہی اور شعرا نے بھی ممکن حد یک غزل کے موضوعات کو بہت وسعت سے آشنا کیا۔ دورِ حاضر میں بھی انسان کئی محاذوں پر برسرِ پیکار ہے۔ سیاسی قیادت کی خود غرضی اور عاقبت نااندیشی سے لے کر ماحول کے جبر تک، مال ودولت کی حرص وہوس سے لے کر اور مفلسی وبدحالی سے لے کر ظلم وجبر اور عدل وانصاف کے قتل تک، ہر حساس انسان شعور کی آنکھ سے دیکھتا اور گیلی لکڑی کی طرح لمحہ لمحہ سلگتا ہے۔ ہر کسی نے معیشت کو ''ٹیک آف'' پوزیشن میں لانے

کے نام پر قوم سے فریب کیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا یہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہم دکھ اور کرب میں مبتلا ہیں۔ آرزو اِس حوالے سے بھی مکتبِ حالی سے متاثر ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غزلیات کا رشتہ عصری صداقت و حقیقت سے استوار کیا ہے۔ اُنھوں نے انفرادی سطح پر بیٹی والوں کے دکھ بیان کیے ہیں تو اجتماعی سطح پر رہبروں کے پُر فریب نعروں کا ذکر کیا ہے جو قیمتی ملبوسات میں بھی بے لباس ہیں:

جسم پر پیرہن تو ہے لیکن
آدمی بے لباس پھر بھی ہے

.....

ہمارے عہد کا انسان بڑا ستم رسیدہ ہے۔ بیچارہ چھوٹی چھوٹی خواہشات اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے جانے کہاں کہاں مارا پھرتا ہے۔ آرزو نے موجودہ عہد کے شخصی اور اجتماعی مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے - عصری تقاضوں کی ترجمانی کی ہے۔ گویا اُن کی غزل نہ صرف انکشاف ذات کرتی ہے، ذاتی غم والم بیان کرتی ہے بلکہ زندگی کی ضرورتوں کا اظہار بھی کرتی ہے۔ ہمارے رہبروں کے خوش نما نعرے اپنی جگہ پر مگر اِس دور میں زیست کرنا چنداں آسان نہیں۔ صاحبانِ اقتدار اگر ضرورت مندوں کی کچھ مدد کرتے بھی ہیں وہ محض دکھاوا ہوتا ہے ریاکاری ہوتی ہے۔ انہیں حاجت مندوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اگر اُن کے دل میں دردمندی اور افرادِ قوم کا احساس ہوتا تو قوم کا ہر فرد مقروض نہ ہوتا اور اِن کی نسلیں کھربوں کے اثاثوں کی مالک نہ ہوتیں - آرزو نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور کیا ہے۔ روایتی خیالی دنیا سے باہر نکل کر، فرسودہ روایات اور غزل میں محض تقلیدی مضامین سے دامن چھڑا کر، فکر و خیال کو وسعت آشنا کیا ہے - اُن کے لہجے میں بلند آہنگی نہیں ہے مگر اُنھوں نے دکھ میں گھرے ہوئے انسان کی حق تلفی، ناانصافی اور ظلم و جبر کے خلاف آواز ضرور اٹھائی ہے۔ اِس طرح اُن کی غزل سیاسی و سماجی صورتِ حال، حق گوئی و صداقت شعاری پر تعزیروں اور عصرِ حاضر کے مسائل و مصائب کی عکاس ہے:

اب لوگ کس طرح نئی منزل کو پائیں گے
رہبر تمام جو ملے، بھٹکے ہوئے ملے

.....

بس منزلِ مقصود ملے ہم کو اے مالک
رہبر بھی کوئی صاحبِ کردار عطا کر

.....

سچائی لب پہ آئی تو یہ حال ہو گیا
حق گو تمام جال میں جکڑے ہوئے ملے

.....

خیال و خواب کا ماحول راس تھا خالق
شعور جاگا تو پائے تصورات کے دکھ

.....

کتنی مشکل میں جان ہے بھائی
گھر میں بیٹی جوان ہے بھائی

جان ہو کیوں نہ یہ عزیز مجھے
جان ہے تو جہان ہے بھائی

.....

ظلم و جبر بڑھا اتنا، ختم ہوا انصاف
دیکھو نوح کی کشتی میں پڑنے لگا شگاف

.....

یہی جو آپ کرتے ہیں دکھاوا اس کو کہتے ہیں
غریبوں پر جو کرتے ہیں عنایت اور ہوتی ہے

.....

مانا پھول بھی کلیاں بھی ہیں، رنگ بھی اُن کے پیارے ہیں
اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن جینا ہے دشوار میاں

.....

نعت گوئی بھی آرزو کے شخصی رجحانات میں اہم ہے۔ اُن کے باطن میں مذہبی چنگاری نہیں بلکہ آگ یا اَلاؤ ہے۔ اُن کے دل و دماغ میں اللہ اور اُس کے حبیبؐ پاک کی محبت کے چراغ روشن ہیں جن کا اُجالا اُن کے کلام میں پھیلا ہوا ہے۔ غزل و نظم کی طرح نعت گوئی بھی انہیں بہت مرغوب ہے۔ اِس سلسلے میں اُن کا ایک نعتیہ انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے اور ''شہرِ آرزو'' میں ایک طرف تو خاصی تعداد میں نعوت شامل ہیں تو دوسری طرف اُن کی غزلیات میں اکثر نعتیہ اشعار بھی پڑھنے میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے فکری اعتبار سے یہ بھی غزل کا ایک منفرد رنگ ہے کہ غزل کے اشعار کے درمیان کہیں بھی نعتیہ اشعار کہے جا سکتے ہیں۔ غالب کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے کہ اُن کے اُردو دیوان میں باقاعدہ کوئی نعت نہیں مگر اُن کے غزلیات میں سات آٹھ نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ مزید برآں نعت کا فکری دائرہ بھی وسیع ہے۔ ہر وہ شعر جس میں رسولؐ اللہ کی ہستی یا آپؐ سے وابستہ واقعات، معجزات، غزوات، شخصیات کا ذکر موجود ہو وہ سب بھی نعت کے زُمرے میں آتے ہیں۔ آرزو کی غزلیات کا عمیق جائزہ لیتے ہیں تو اُن میں شہ کونینؐ، اہلِ بیت اطہارؑ، اصحاب کرامؓ اور اصحاب کربلاؓ کا بھی بڑی عقیدت سے ذکر پڑھنے میں آتا ہے۔ اُن کے کلام میں مقدس ہستیوں کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالق آرزو کے دل و دماغ میں حسینیت اور یزیدیت کا تصور اور حق و باطل کے معیارات کتنے واضح ہیں۔ ہر وہ انسان جو زندگی کی جنگ میں سچائی کا ساتھ دینا چاہتا ہے، اُس کے شعور و لاشعور میں آلِ رسولؐ کی کربلا میں دی گئی قربانیوں کا مدعا و مقصد بالکل واضح ہونا چاہیے۔ اِس لیے کہ حسینیت قیامت تک سچائی، راستی، جدوجہد اور قربانی کا استعارہ ہے۔ ''شہرِ آرزو'' کی غزلیات سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اگر چہ گھر میں فاقہ ہو، مگر سائل کو کھانا دیں
نبی کی آل کی شانِ سخاوت اور ہوتی ہے

.....

اصغرِ بے شیر سے دین کا گلشن ہرا
پاک خوں کے فیض ہی سے گلستاں ہے زندگی

ذہن کہتے ہیں سبھی سود و زیاں ہے زندگی
میں سمجھتا ہوں کہ عشقِ پنج تناں ہے زندگی

.....

لب پہ تشنہ لبی وہ اصغر سی
دور اُس کا خمار مت کر

.....

تم نے عشقِ رسولؐ پایا ہے
یہ صلہ بھی بلالؓ درد کا ہے

.....

حُر کو پانی دیا رہے پیاسے
ابنِ حیدرؓ سوال درد کا ہے

.....

بے ثباتی اور تغیر و تبدل شاید دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ سوائے خالقِ کائنات کے ہر شے کو فنا ہے۔ ہر چیز ناپائیدار ہے۔ جو کل تھا آج نہیں ہے۔ جو آج ہے کل نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ ہمارا فردا بھی ماضی ایک روز ماضی بن جائے گا۔ زندگی، دنیا اور اس کی تمام اشیا کے عارضی اور ناپائیدار ہونے کا تصور انسان کو غرور و تکبر سے محفوظ رکھتا ہے۔ انسان ظلم و ناانصافی اور جبر و استحصال سے بچ جاتا ہے۔ موت، میزانِ عدل اور حیات بعد الموت کا تصور انسان کو صراطِ مستقیم پر رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں حیات بعد الموت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور اُس مذہب کے ماننے والوں کی زندگی پر بھرپور اثرات مرتب کرتا ہے۔ موت کے بعد انسان کی زندگی کیسی ہوگی،
اِس بات کا احساس انسان کو اِس دنیا کی زندگی میں اسلوبِ حیات متعین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اخلاقی بنیادیں مضبوط رہتی ہیں اور انسانی معاشرہ محبت، ایثار اور خلوص کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اِس لیے ہمارے شعرا نے بھی بے ثباتی کے موضوع پر خوب لکھا ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اِس موضوع پر اشعار نہ کہے ہوں۔ دکنی ادب میں عشق و محبت اور تصوف کا غلبہ رہا ہے۔ خواجہ میر درد نے تصوف کے زیرِ اثر موت و حیات کو اشعار میں پیش کیا ہے۔ غالب زندگی کی تعمیرِ نو میں موت کے کردار کو زیرِ بحث لایا ہے۔ جہاں یہ موضوع آئے گا وہاں اخلاقیات کا ذکر بھی ضرور ہوگا۔ خالق آرزو ایک محبتی اور حساس انسان ہیں۔ اُنھوں نے حیات و مرگ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ زندگی کی ساری کہانی قبر کے کتبے بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ وقت بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیتا ہے۔ جنھیں اپنی طاقت کا گھمنڈ ہوتا ہے انھیں ایک پل میں پچھاڑ دیتا ہے۔ وقت کی تیز آندھی

سے ڈرتے رہو یہ بڑے بڑے مینار گرا دیتی ہے۔ ہمارے وہ دوست اور عزیز جن کے بغیر ہم زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ہماری بے بسی ہے کہ وہ ہمیں روتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا آرزو کا کہنا ہے کہ انسان تو انسان پرندوں پر بھی کبھی ظلم نہ کرو۔ مال و زر کی محبت کو دل میں سمانے مت دو کہ یہی دنیا میں تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر دولت کی ہوس سے بچ گئے تو خلد کے راستے کھل جائیں۔

فخر کیسا ! زندگی پر کب کسی کو اختیار
قبر کے کتبے میں مٹی تیری جاں ہے زندگی

.....

کیا بھروسہ پچھاڑ دے پل میں
وقت اک پہلوان ہے بھائی

.....

مار ڈالے گی یہ اُن کی مجھے کھینچا تانی
اس طرف زندگی، اُس سمت قضا کھینچتی ہے

دھن والوں کے ناز ہیں جھوٹے، ڈرنا وقت کی آندھی سے
لمحہ بھر میں گر پڑتے ہیں بڑے بڑے مینار میاں
ٹوٹ جائیں گے رشتے دوستوں عزیزوں سے
زندگی کسی کی بھی ہم سفر نہیں ہوتی

راہ یہ اختیار مت کر
تم پرندے شکار مت کر

مل ہی جائے گا خلد کا رستہ
مال و دولت سے پیار مت کر

آرزو صرف غزل کے شاعر نہیں ہیں، اُنہوں نے بہترین موضوعاتی نظمیں بھی لکھی ہیں اور اُن کے لیے جدید اسلوب اپنا کر پابند، آزاد اور نثری ہیئتوں کا انتخاب کیا ہے۔ اُن کی نظمیں اپنا منفرد رنگ رکھتی ہیں۔ حب الوطنی، زندگی اور محبت اُن کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔ اُنھوں نے اپنی قومی و ملی نظموں میں قومی تاریخ کی بہترین سیاسی اور علمی و ادبی شخصیات کو خراجِ احساس پیش کیا ہے۔ اُن شخصی نظموں میں آرزو نے اپنے مرحوم اور بہ قیدِ حیات دوستوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ایسا موضوعاتی کلام، ''شہرِ آرزو'' کے خالق کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ جب تک شاعر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل نہ ہو، فکر میں زرخیزی نہ ہو، بڑی تعداد میں موضوعاتی و شخصی نظمیں لکھنا چنداں آسان کام نہیں۔ ایسی نظموں میں ایک طرح سی مشاہیر کے کارناموں پر بات کر کے نسلِ نو کی تربیت کی گئی ہے۔ انہیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ زندگی اور اُس کے متعلقات پر کہی گئی نظموں میں نظم نگار کی ژرف نگاہی اور بصیرت واضح ہے۔ اپنی نظم ''زندگی'' میں شاعر نے عمدہ انداز میں زندگی کے مختلف روپ بیان کیے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی ایک اپنی مختلف کہانی لیے ہوتی ہے۔ آرزو نے اِن مختلف جہات کو نظم میں ڈھالا ہے۔ ہر شاعر کبھی نہ کبھی حب الوطنی پر مبنی نظم ضرور لکھتا ہے

کیوں کہ اپنے وطن کی مٹی سے محبت انسان کی فطرت اور جبلت کا تقاضا۔ قومی و ملی شاعری نے دراصل ۱۸۵۷ کے بعد تحریک کی شکل اختیار کی تھی۔ آرزو کے دل میں وطن کی محبت جاگزیں ہے اور وہ یہ اساس آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اُردو ادب کے نقاد عبدالقادر سروری کا کہنا ہے:

''قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی روح، جدید اُردو شاعری کا بڑا وصف ہے''

وطن کی خاک سے خوشبو نکلتی ہے
ہماری سر زمیں سونا اُگلتی ہے

.....

ہمارا دیس ہے رشکِ چمن گویا
عطائے خاص ہیں سرو و سمن گویا

.....

ذخائر کی بڑی بہتات ہے اِس میں
زمیں زرخیز ہے ہر دھات ہے اِس میں

.....

نکالیں گے چھپے جو بھی خزانے ہیں
یہی خوش حال ہونے کے بہانے ہیں

.....

آرزو نے داخلی احساسات اور خارجی مشاہدات دونوں کا اثر قبول کیا ہے۔ گویا نظمیں دل سے بھی لکھی ہیں اور دماغ سے بھی۔ بہت سے معاصر نظم نگاروں کے برعکس، آرزو کی نظمیں مبہم ہیں اور نہ ہی بے ماجرا اور لایعنی۔ اِس لیے کہ اُن کے نظموں کی تفہیم مشکل نہیں۔ وہ قاری پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے رائج الوقت استعارات، علائم اور تشبیہات استعمال کی ہیں۔ قارئین کا امتحان نہیں لیا۔

آرزو کے کلام کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اُن کی غزل کی طرح نظم میں بھی مجھے اُن کے پوری شخصیت جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ اُن کے خارجی مشاہدات بھی کیوں نہ ہوں، وہ اُن کو اپنے اوپر طاری کر کے اُنھیں شدت سے محسوس کرتے ہیں اور ایک طرح سے جگ بیتی کو بھی ہڈ بیتی بنا دیتے ہیں۔ اِس کا ایک بڑا فائدہ بہر حال یہ ضرور ہوتا ہے کہ کلام، احساس کی لو تیز ہونے کی وجہ سے تاثر اور شعریت سے مملو ہو جاتا ہے محض سپاٹ بیانیہ نہیں رہتا۔ اِس طرح اُن کی شخصیت کلام سے دور نہیں اُس میں رچ بس گئی ہے۔ اُن کی نظمیں اور غزلیں داخلی جذبات اور خارجی مشاہدات و تجربات کی آمیزش سے تشکیل پائی ہیں۔

محبت کے موضوع پر اپنی ایک آزاد نظم ''تعطر'' میں اُنھوں نے داخلی احساسات کو بہت خوب صورت اسلوب میں نظم کیا ہے:

مری سوچوں کے پردے پر جو چہرہ مسکراتا ہے
کوئی صورت جو بنتی ہے سنورتی ہے
مجھے مسحور کرتی ہے
کہ جیسے رات کی رانی کسی کو اپنی خوشبو سے
معطر کر رہی ہو
مرے احساس کو اُس نے معطر کر دیا ہے
فقط میں ہی نہیں
خوشبو میں یہ لپٹا ہوا ماحول بھی اُس سے معطر ہے

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر ابرار عمر کی شہکار تخلیق ''دوسری بارش''

کسی انسان کو تخلیقی جوہر عطا کرتے ہوئے قدرت اس پر حد درجہ مہربان ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں اس کے شعور و فکر کو کشادگی اور رفعت عطا کی جاتی ہے۔ یہ ادب کے ساتھ ساتھ انسان کا بھی ارتقائی سفر ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کسی کے فن اور خوبی کے اعتراف کے لیے ظرف کو بڑا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہنرمندی اور فن کی قبولیت کے لیے دل گردہ ہونا چاہیے۔ تقریباً دس ہزار سالہ انسانی تاریخ میں قدرت نے ارتقا کا سفر جاری رکھا ہے اس نے کائنات کو بانجھ نہیں کیا نا آگے کرے گی۔ اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر اس دنیا میں موجود ہوتا ہے صرف تلاش اور پرکھ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے ساتھ اسے اس کا جائز مقام دینا بھی نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ یہی چیز جدت طرازی بھی کہلاتی ہے۔ خدا تعالیٰ سب سے بہترین اور سب سے بڑا تخلیق کار ہے اور اس نے یہ خوبی اپنے نائب یعنی حضرت انسان میں بھی رکھی ہے۔ قدرت انسان کو اس کی ریاضت اور ظرف کے مطابق تخلیقی جوہر عطا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ اقوام اس پراسس کو سمجھتی ہیں اور اسے قبول بھی کرتی ہیں اس لیے وہاں تخلیق کاروں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور ان کو معاشرے کا بہترین اور فعال فرد سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس پس ماندہ اور جاہل اقوام تخلیقی پراسس کو سمجھنے سے قاصر ہوتی ہیں یا بوجوہ قبول نہیں کرتی اور اگر کوئی غیر معمولی شخص ان میں پیدا ہو جائے تو بوزنے اسے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اسے معاشرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، اس پر زندگی تنگ کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تاکہ یا تو وہ معاشرے سے کنارہ کش ہو جائے یا خودکشی کر لے۔ کیونکہ جو نالائق، نااہل اور بددیانت لوگ اداروں اور وسائل پر قابض ہوتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ان کی جگہ کوئی قابل، دیانتدار اور لائق شخص بیٹھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سنجیدہ اور اہل لوگوں کے آگے آنے کی وجہ سے ان کی چھٹی ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے پاکستان بھی انھی معاشروں میں سے ایک ہے

فیصل زمان چشتی

جہاں ہر شعبہ زندگی میں نالائق ، بددیانت اور نااہل لوگ مسلط ہیں۔ صفر کو سو فیصد کرنا اور سو فیصد کو صفر کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ہمارے معاشرے کی جہالت اور پسماندگی میں انھی لوگوں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔

دیگر تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں بھی یہ کلاس پچھلے ستر سالوں سے اداروں اور وسائل پر قابض ہے اور ہر جگہ پر اپنی اجارہ داریاں قائم کر رکھی ہیں۔ ادبی اداروں کے بورڈ آف گورنرز اور ہر قسم کی کمیٹیوں میں یہ لوگ شامل ہو کر فیصلوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرد پس تشکیل دے کر ہر شاخ پر الو بٹھا دیا گئے ہیں۔ کیونکہ یہ خود کمتر تخلیقی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں اور اپنے سے بھی بڑے نالائقوں کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہیں تا کہ حقیقی تخلیق کاروں اور اہل افراد کے راستے روکے جائیں۔ ان لوگوں نے کئی دہائیوں سے ادب کا ارتقائی سفر روک رکھا ہے اور اس کے بیت کے جواز بھی فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ یہی کہتے پائے جاتے ہیں کہ اب وہ شاعر نہیں رہے وہ ادیب نہیں رہے وہ باتیں نہیں رہیں۔ صرف خود کو افلاطون سمجھتے ہیں صرف چند شعرا کو اپنا آئیڈیل بنا کر ان کی تشہیر کرتے پھرتے ہیں اور ان کی شاعری کو ہی ادب کا کل سرمایہ گردانتے ہیں۔ ادب کے ارتقائی سفر پر فل سٹاپ لگا کر خود مزے کر رہے ہیں جس کی وجہ سے جینوئن اور حقیقی تخلیق کاروں کی مسلسل حوصلہ شکنی ہو رہی ہے اور ان کے حقوق پر ڈاکے مارے جا رہے ہیں جو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے زہر قاتل ہے۔ ادب کے کارپردازوں نے معاصرانہ چشمک، جھوٹی انا اور خود ساختہ رقابت میں ادب کا بیڑا غرق کر دیا ہے جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ نوجوان تو درکنار سینئرز کے کام کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا۔ من پسند افراد آگے لائے جا رہے ہیں اور انہیں ہی پروموٹ کیا جاتا ہے مشاعروں اور کانفرنسز (جو ادب کی ترویج کے بجائے اس کے زوال کا باعث ہیں) میں بھی انہی لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اگر من پسند افراد کے علاوہ کوئی آگے بڑھنے کی کوشش بھی کرے تو طرح طرح کے الزامات لگا کر اسے منظر نامے سے آوٹ کر دیا جاتا ہے۔

اتنی طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ ادبی منظر نامے سے کچھ واقفیت حاصل ہو سکے۔

اسلام آباد کے ادبی افق پر ڈاکٹر ابرار عمر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ سینئر شعرا کی فہرست سے تعلق رکھتے ہیں اور نوے کی دہائی کے نہایت عمدہ اور منفرد اسلوب کے دبنگ شاعر ہیں جنھوں نے نوجوانی میں ہی بہترین اور اعلیٰ ادب تخلیق کیا جو ان کی اعلیٰ شعری تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر بھی تھا لیکن وہ چاپلوسی، کاسہ لیسی اور خوشامد جیسی صفات سے بالکل پاک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے ادبی ٹھیکیداروں کی نظر میں کھٹکنے لگے بلکہ چبھنے بھی لگے پھر کیا تھا وہی کچھ کیا گیا جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہر سطح پر اور ہر جگہ پر ان کی

حوصلہ شکنی کی گئی ان کے راستے مسدود کیے گئے۔ جیسا کہ ایک حقیقی تخلیق کار عام آدمی سے زیادہ حساس ہوتا ہے اسی وجہ سے ڈاکٹر ابرار عمر نے بھی اس برتاؤ کو زیادہ محسوس کیا اور دل پر لے لیا اور وہ اس سسٹم سے مایوس ہونے کے ساتھ ساتھ نالاں بھی ہیں۔ انہوں نے ادبی حوالے سے ایک طرح کی گوشہ نشینی اختیار کر لی 1998 سے 2004 تک ان کے چھ شعری مجموعے منصۂ شہود پر آئے جس سے ان کے شعری وفور اور ادبی جنون کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اب تک کیا ہوا یہ ایک الگ داستان ہے اور الگ سے کئی مضامین کی متقاضی ہے۔

آج ہم صرف ان کے ایک خوبصورت شعری مجموعے ''دوسری بارش'' پر بات کریں گے جو 2004 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان کا تخلیقی شعور اپنے بام کمال پر نظر آتا ہے۔ یہ شعری مجموعہ ناصر کاظمی کے شعری مجموعے ''پہلی بارش'' کے تتبع میں لکھا گیا۔ جس کو طویل غزل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ ''پہلی بارش'' کی بحر اور اسی قافیہ ردیف میں لکھی گئی ہے جو اپنے اسلوب، کرافٹ، بنت، خیال اور الفاظ کے چناؤ میں ایک شہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

دیکھا جائے تو یہ کتاب 2004 میں شائع ہوئی اور ادب کی بدقسمتی دیکھیے کہ ابھی تک ناقدین اور محققین کے ساتھ ساتھ ادبی اداروں کی نظر سے دور ہے۔ کیا وجہ ہے یہ کتاب ناصر کاظمی کتاب ''پہلی بارش'' کے مقابلے میں وہ پذیرائی حاصل نہ کر سکی جس کی یہ حقدار تھی۔ حالانکہ اس کے کلام کا معیار اور عظمت کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ مگر وہی سوچ آڑے آئی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ اب وہ شاعر کہاں اب وہ شاعری کہاں اور اس کے ساتھ ساتھ حقیقی شاعر اور خالص شاعری کا قلع قمع کرنے کی مذموم سازش بھی کارفرما رہی۔

جب تک آپ کسی شاعر کو پڑھیں گے نہیں ریسرچ نہیں کریں گے۔ ڈسکس نہیں کریں گے ان کی تخلیقات پر اداروں میں کام نہیں ہوگا آپ کیسے اس کے مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ ہر دور کا اپنا میر اپنا غالب اور اپنا مصحفی ہوتا ہے اس کو قبول کرنا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا ادب کے وجود کو۔ اگر آج بھی پہلے کی طرح آنکھوں کو بند رکھا گیا بے اعتنائی برتی گئی تو آج کا شاعر جو بیناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے جو روشن امکانات کا حامل ہے اور نئے راستوں کا نقیب بھی ہے کو ضائع کر دیں گے اور آپ انہی پرانے ادوار کے بوسیدہ در و بام کو چوم کر انہیں ہی کل کائنات سمجھ کر پہلے کی طرح خود فریبی کا شکار رہیں گے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور آپ کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوگی۔ یہ سب کچھ چند افراد کو نوازنے اور انہیں افلاطون ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا رہا ہے۔

جس طرح ناصر کاظمی نے میر تقی میر کی روایت کو

اپنے زمانے اور عہد کی ضرورت کے مُطابق آگے بڑھایا اور شعر و ادب کی ترویج میں اپنا کردار ادا کیا بالکل اسی طرح ڈاکٹر ابرار عمر نے بھی ناصر کاظمی کی روایت کو اپنے عہد اور روایات کے حساب سے آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس طرح آپ نے ناصر کاظمی کو قبول کیا ہے اسی طرح کھلے دل سے ڈاکٹر ابرار عمر کو بھی قبول کریں تاکہ آپ ادبی بددیانتی کے مرتکب نہ ہوں اور شعر و ادب کا ارتقائی سفر بھی پوری آب و تاب اور شان و شوکت سے اگلی منزلوں کی جانب چلتا رہے اور آنے والا ادیب اور قاری آپ پر چار حرف نہ بھیجے۔

ڈاکٹر ابرار عمر نے اپنے خوبصورت شعری مجموعے ''دوسری بارش'' میں واقعی شاعری کا حق ادا کیا ہے اور یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ آپ پوری کتاب میں ایک قافیہ اور ردیف کے ساتھ مختلف خیالات و مضامین باندھیں۔ دہرائے جانے کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ بات کہنے کے امکانات محدود ہونے لگتے ہیں مخصوص بحر اور ایک ہی قافیہ ردیف سے جگہ کم ملتی ہے غرضیکہ ہر طرف سے بندشیں اور جکڑ بندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں شاعر کی فنی و فکری ریاضت کام آتی ہے کہ وہ محدود اور مخصوص طرز و اسلوب میں اپنا خیال اور مدعا بیان کرے اور میں پوری ایمانداری اور وثوق سے کہتا ہوں کہ ڈاکٹر ابرار عمر اس حوالے سے بڑا زرخیز اور عالی دماغ رکھتے ہیں جنھوں نے یہ بڑا چیلنج قبول کیا اور ہر ممکن خیال اور امکان دریافت کیا جو کام بظاہر بہت مشکل تھا انہوں نے اپنے شعری وفور اور فکری شعور کی بدولت بڑی سہولت، صراحت اور فنی پختگی سے بڑی کامیابی سے مکمل کیا۔ ان کے خیالات کے دلفریب بہاؤ اور گہرے فکری رچاؤ سے ایسی شاعری سامنے آئی ہے جو اس عہد کا مان بھی ہے اردو ادب کا اثاثہ بھی ہے۔

ڈاکٹر ابرار عمر بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں اور ترقی پسندی ان کے بدن میں خون بن کے دوڑتی ہے۔ وہ ظلم اور جبر دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتے اس لیے ان کی شاعری میں انقلاب کے سورج کی تمازت بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری اندھیرے کو اجالا کرنے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ اس لیے جہاں جہاں ان کے اشعار کی ضوفشانی ہے وہاں وہاں امید کی کرنیں ماحول میں روشنی پھیلا رہی ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسا جہان ہے جو ان کے خیال و فکر کی جولانیوں اور شعور و ادراک کی تابانیوں سے بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیے:

خنجر تھا انسان کے ہاتھ میں
سامنے بھی انسان کھڑا تھا

کالی رات کے خوف کو اوڑھے
سورج کا سپنا دیکھا تھا

بارش بارش کرنے والا
آگ کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا

رات کے دروازے پر بیٹھا
دن کی راہ کو دیکھ رہا تھا

آج کا سورج بھی ڈوبے گا
کل کا سورج ڈوب گیا تھا

.....

زیرِ نظر کتاب ''دوسری بارش'' کی ایک خاص فضا ہے، ایک خاص ردھم ہے، ایک رچاؤ ہے، ایک خاص کیفیت ہے ایک خوبصورت اور دلفریب ماحول ہے جو سننے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس کتاب میں استعاراتی نظام، تشبیہاتی پیٹرن، جمالیات اور منظر نگاری کی دلکشی انسانی خیال وفکر کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور جب کوئی صاحب درد اور صاحب دل ایسی شعری فضا میں داخل ہو جائے تو بڑے عرصے تک اس ماحول کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتا یہی ڈاکٹر ابرار عمر کا کمال ہے کہ اس کا شعوری اور فکری جہان حسیات اور جذبات کو پوری طرح ہیپناٹائز کر لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طویل غزل ایک ایسا تخلیقی شاہکار ہے جس میں اعلیٰ ادب تخلیق کیا گیا ہے اور اس کے موضوعات، بنت، کرافٹ، فنی مہارت، آگہی، فکری میلان، تخلیقی وفور، داخلی و خارجی صورتحال اور جدت طرازی اس کو اعلیٰ تخلیقی شہ پارہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے:

رات کا چرخہ گھوم رہا تھا
میں تنہائی کات رہا تھا

کتنی سفاکی سے سرجن
دل کا رستہ ڈھونڈ رہا تھا

آؤ خوشبو خوشبو کھیلیں
وہ یہ کہہ کر بھول گیا تھا

پیچھے اک تصویر پڑی تھی
سامنے مکڑی کا جالا تھا

گملے میں تنہائی اگی تھی
جس سے میں باتیں کرتا تھا

.....

جس شاعری میں دکھ اور کرب کا عنصر موجود نہ ہو وہ پھیکی اور بے رس ہوتی ہے اور دلوں کے تار نہیں چھیڑ سکتی۔ اثر پذیری اور نمو کا عمل دلوں کو دکھ کی آبیاری سے ہی میسر آتا ہے اور ڈاکٹر ابرار عمر ایسے شاعر ہیں جنھوں نے عمل تخلیق کے ذریعے سانحات اور انسانی المیوں کو اس فنی مہارت اور پختہ کاری سے بیان کیا ہے جو ایک نبض شناس حقیقی تخلیق کار کا ہی خاصا ہو سکتا ہے۔ درد کی خوشبو اور محبت کی چاشنی سے پروان چڑھنے والی شاعری کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ محبت، عشق، ہجر و وصال جیسے فطری جذبات سے مزین شاعری اپنی شدت احساس سے انسان کے اعصاب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کیونکہ یہ جذبات ہر انسان کے خمیر میں پیدائشی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ جب شعر کی چوٹ سے ان کو مہمیز ملتی ہے تو جذبات کے سمندر میں مدو جذر آنا ایک فطری سی بات ہوتی ہے:

کمرے سے جب وہ نکلا تھا
دل سی سینے سے نکل گیا تھا

کوئی بات تو کرتا مجھ سے
میں خوشبو کو ترس گیا تھا

عین بہاروں کے موسم میں
میں اک دکھ کی نذر ہوا تھا

ہم دونوں روئے تھے اتنا
دریا بھی ناراض ہوا تھا

بات ذرا سی اس نے کی تھی
گھاؤ سمندر سے گہرا تھا

.....

ڈاکٹر ابرار عمر کا شعری جہان اپنے اندر آسمان کی سی وسعتیں، زمین جیسی ہمواریاں اور سمندر جیسی گہرائیاں لیے ہوئے ہے۔ ان کا فکری کینوس بہت وسیع ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں آفاقیت در آتی ہے ان کے موضوعات کا تنوع اور ان کی فکری اڑان ان کے شعری اثاثے کو قیمتی کر دیتا ہے۔ عہد حاضر میں بہت کم ایسے شعراء ہیں جن کا فہم و ادراک عہد حاضر کے مسائل اور سماج کے پر پیچ راستوں پر چلتا ہوا ہمارے ذہنوں پر دستک دیتا ہو۔ جس سے ان کی شعری عظمت ہمارے ذہنوں میں اور زیادہ راسخ ہو جاتی ہے۔ تجرباتی فکر اور عصری شعور کے باہمی ربط سے جو شاعری تخلیق پاتی ہے وہ ابرار عمر کی شاعری ہے۔ انھوں نے علم، تہذیب، ثقافت اور شعر و ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کی ہے اور ان حوالوں سے دعوت فکر بھی دی ہے یہ ایک بڑے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر ابرار عمر عظمت رفتہ کا پاسبان بھی ہے اور معاشرے کو عہد حاضر میں درپیش چیلنجز میں شعوری سطح پر مورال بھی بلند کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ابرار عمر کی شاعری اپنے اسلوب کے لحاظ سے اور فکری سطح پر آئندگان کے لیے ذہنی تربیت کا بھی اہتمام کرتی ہے یہ بات اس کو اپنے ہمعصرین سے ممتاز کرتی ہے۔

درج ذیل اشعار ڈاکٹر ابرار عمر کی زیر نظر کتاب ''دوسری بارش'' کے بارے میں میری رائے کو معتبر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ شعر پڑھیے اور سر دھنیے:

اس کے آنسو پھیل گئے تھے
سارا منظر بھیگ گیا تھا

میرے ناخن میرا چہرہ
لوگوں کا پھر کیا جاتا تھا

میری بات تو سنتے جاؤ
میں لمحوں سے لپٹ گیا تھا

میں نے اس کی آنکھ کے رستے
اپنا چہرہ دیکھ لیا تھا

اس نے ایک نظر دیکھا تھا
دل پھر پہروں تک دھڑکا تھا

اس کو جوڑنے کی خواہش میں
میں اندر سے ٹوٹ رہا تھا

سب کی خاطر لڑنے والا
اپنی جنگ میں ہار گیا تھا

کتنے خوابوں کی لاشوں کو
اپنے ساتھ لیے چلتا تھا

وحشی رات ہوا کا پتھر
جسم کا شیشہ توڑ رہا تھا

رات کے گہرے سناٹے میں
تنہا پنچھی بول رہا تھا

اپنے اپنے دکھ تھے سب کے
اپنا اپنا یاد آیا تھا

☆☆☆☆☆

اردو کے ممتاز شاعر جناب بشیر احمد بشیر

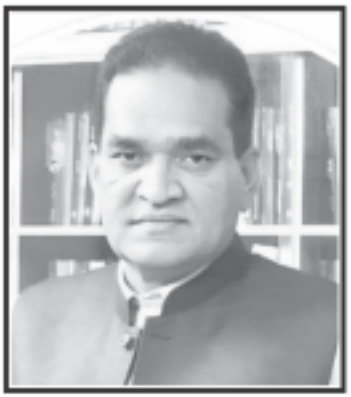

اردو غزل کو ثروت مند کرنے والے باہنر شاعروں میں جناب بشیر احمد بشیر کے تخلیقی کام کو کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا----وہ ایک بلند قامت غزل گو اور ماہرِ علمِ عروض کی مضبوط شناخت کا حوالہ تھے----جدت اور قدامت کے حسین امتزاج نے ان کی تخلیقی فضا کو نہایت دلنشیں اور دلفریب بنادیا تھا------

لکھوں وہ بات دل پہ جو وارد نہیں ہوئی
یہ اِذن مجھ کو میرے ہنر نے نہیں دیا

بے خیالی میں اُٹھاتے ہی کتاب
کوئی کھلتا ہوا در یاد آیا

کل کسی بھیس میں ہم لوگ نہ جانے آجائیں
ہم فقیروں کو حقارت سے نہ دیکھو، دیکھو

سو پیرائے ڈھونڈے پھر بھی آج کے دن تک عاجز ہیں
ہائے وہ بات جو کہہ بھی نہ پائے اور دفتر تحریر ہوئے

....

جہاں اُن کے دیگر بہت سے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہوئے وہاں اُن کے درج ذیل شعروں کو بہت عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی بھرپور مقبولیت حاصل ہے اپنی مضمون آفرینی، معنویت اور تازگی کی خصوصیات کے ساتھ اہلِ سخن کے ذہنوں میں ہمیشہ روشن رہے ہیں:

تشنہ لب آؤ تشنہ لب جاؤ
زندگی ہے فرات کا دریا

علی رضا

وہ دن وہ محفلیں وہ شگفتہ مزاج لوگ
موجِ زمانہ لے گئی کیا جانے کس طرف

....

اتار لو انھیں دل میں کہ پھر نہ دیکھو گے
یہ صورتیں جو ہیں اب جلوہ بار ہم نفسو

....

جناب بشیر احمد بشیر ایک وسیع المطالعہ اور باکمال دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ عام زندگی میں عجز اور انکسار کی مجسم تصویر تھے ----اپنی علمی متاع اور فنی سرمایا طالبانِ علم و سخن میں خیرات کرنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب اور بے قرار رہتے---ایک احساس شدت سے ان کی ذات سے لپٹا رہا اور وہ تھا احساس رایگانی کہ لوگ ان کے خزینہ علم وفضل سے اس طرح کسب فیض نہیں کر سکے جو انھیں کرنا چاہیے تھا انھوں نے اس تاثر کو اس طرح بیان کیا ہے:

سمجھا نہ کوئی کہتا ہے کیا کون ہے یہ شخص
میں گنجِ بے بہا تھا مگر رایگاں گیا

ہے کون اس دیار میں حرف آشنا بشیر
افسوس اپنا سارا ہنر رایگاں گیا

....

ان کا سرمایہ سخن ان کے تخلیق کیے ہوئے شعری مجموعہ ہائے کلام قوسِ خیال (اردو)، بات تری ورق ورق (اردو)، رختِ نوا (اردو) اپنے ساہ دا سیک (پنجابی) اور شعری "کلیاتِ بشیر" کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے......

جناب بشیر احمد بشیر نے ایک عہد کی تخلیقی تربیت کی ان سے فیض پانے والے بہت سے لوگ بعدازاں علم وادب اور تخلیقِ سخن کے شعبوں میں بلند مرتبے پر فائز ہوئے-----

اُنھوں نے مستقل سکونت کے لیے ساہیوال (منٹگمری) ہی کا انتخاب کیے رکھا، ناموری، شہرت اور ترقی کے زینے سر کرنے کے لیے کسی بڑے ادبی مرکز کی طرف رُخ کرنے کے احساس اور طلب کی خواہش نے ان کے باطن کی روشنیوں کو کم نہیں ہونے دیا انھوں نے یہیں اپنا فنی سفر جاری رکھا، اسی کنجِ عافیت میں زندگی کی مسافت تمام کی۔ اسی دیارِ خوش آثار کی فضاؤں سے اپنی قلبی وابستگی اور والہانہ پن کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے کہا---

منٹگمری کی مہکتی شام کیا کہنا ترا
تیرے سایوں میں غمِ دل ہے غمِ دنیا نہیں

....

جناب بشیر احمد بشیر کی شاعری کی مجموعی فضا خدائے سخن میر تقی میر کے اُسلوب سے ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے

ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے میں دیگر

دوستوں واصف سجاد، غضنفر عباس سید، محمد شہزاد انجم اور ضیغم رضوی کے ساتھ قبلہ بشیر احمد بشیر کی نشستوں کا حصہ تھے--- حاجی صاحب کے ہاں حاضری سے پہلے ہم سب دوست اس حوالے سے فکر مند ہوتے کہ کوئی نہ کوئی تازہ تخلیق لے کر ہی حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جائے ورنہ اگر انھوں نے کوئی نئی چیز سنانے کی فرمائش کر دی تو کیا ہوگا لہٰذا ہم سب قبلہ حاجی صاحب کی تحریک پر تخلیق سخن کے عمل سے جُوے رہتے---

جناب بشیر احمد بشیر کے معاصرین میں جناب جعفر شیرازی، جناب گوہر ہوشیار پوری، جناب ناصر شہزاد، جناب محمود علی محمود جیسے صاحبِ اسلوب شعرا شامل تھے---اردو غزل کی ایک اور توانا آواز سید شوکت ہاشمی محکمہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے طور پر ساہیوال آئے تو پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے وہ حاجی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے حاجی صاحب کی معیت میں شوکت ہاشمی صاحب کی رہائش گاہ پر ہماری لاتعداد محفلیں جمتی رہیں جن میں جناب گوہر ہوشیار پوری، جناب ناصر شہزاد، جناب پروفیسر ارجمند قریشی، جناب واصف سجاد، جناب شہزاد انجم اور غضنفر عباس سید بھی شریک ہوتے --- کبھی کبھی یہ محفلیں قبلہ حاجی صاحب کے ہاں بھی سج جاتیں ----ایک رات حاجی صاحب کے ہاں ایسی محفل سجی جو صبح نماز فجر تک جاری رہی اس محفل میں حاجی صاحب کے فرزند ارجمند منیب سلطان کی خوبصورت آواز میں شوکت ہاشمی کی کافیاں اور حاجی صاحب کی غزلیں ساز و آواز کے ساتھ سُنی گئیں---اس محفل میں دوسری احباب کے ساتھ حاجی صاحب کو بھی مروتاً تمام رات جاگنا پڑا---منیب سلطان شوقیہ فنکار کے طور پر شب بھر یکسوئی سے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے---رات ڈھلنے پر ہم سب اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور پھر ایک دن ایسا آیا جب حاجی صاحب بھی ایک ایسے جہان کی طرف محوِ پرواز ہوئے جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں لوٹتا--- جناب حاجی بشیر احمد بشیر آج سے 22 برس قبل 23 جون 2002 کو اس جہانِ فانی سے منزل ابد کی طرف روانہ ہو کر سپردِ رحمتِ خداوندی ہوئے وہ طارق بن زیاد کالونی ساہیوال سے ملحقہ ذیلدار کالونی سے متصل قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں---

سپردِ رحمتِ خداوندی ہوئے وہ طارق بن زیاد کالونی ساہیوال سے ملحقہ ذیلدار کالونی سے متصل قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں---

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

☆☆☆☆☆

جدید ادبیات و علمیات.....ڈاکٹر اسلم انصاری

صدام ساگر

ملتان کی تاریخی، ثقافتی، روحانی، علمی، ادبی اہمیت دنیا بھر میں اپنا مقام رکھتی ہے، یہ سر زمین بصیرت کے نور سے دمکتی ہے۔ بہار کا موسم آتے ہی یہاں ہر طرف خوشبودار پھل اور پھول کھلنے لگتے ہیں ایسے میں بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ کے روضے کی جالیوں سے باہر جھانکنے والی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ کے ایک مبارک دن بیرون پاک گیٹ ملتان کے ایک پرانی طرز کے مکان میں حاجی قاسم علی کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام محمد اسلم رکھا گیا جو بعد میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام سے علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہُوا۔ ان کے آباؤ اجداد ملتان کے قدیم باشندے تھے، ان کے گھر کا ماحول مذہبی اور ادبی تھا جس آبائی گھر میں ان کی پرورش ہوئی وہ اپنے محلے میں ''پھولوں والی حویلی'' کے نام سے مشہور تھا۔ ان کا کتابیں پڑھنے کا آغاز بھی اسی حویلی سے ہُوا۔ بقول ان کہ ''میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میرا گھر ہر قسم کی علمی، ادبی تاریخی اور مذہبی کتابوں سے اٹا ٹوٹ بھرا پڑا تھا لیکن میں نے جس پہلی کتاب کو بغیر اُستاد کی مدد کے خود بہ خود پڑھنا شروع کر دیا تھا وہ دارالاشاعت پنجاب (لاہور) کی شائع

کردہ ''داستانِ امیر حمزہ'' کی ایک دلچسپ تلخیص تھی جو ابوالاثر حفیظ جالندھری کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی۔''

ڈاکٹر اسلم انصاری کے تعلیمی سفر کی بات کریں تو انھوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۵ میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور ایمرسن کالج ملتان (موجودہ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ) میں ایف۔اے میں داخلہ لیا، اسی تاریخی درس گاہ سے انہوں نے ۱۹۵۷ میں ایف۔اے اور ۱۹۵۹ میں بی۔اے (آنرز) کیا۔ اعلیٰ تعلیم کی خواہش انہیں ملتان سے شہرِ لاہور لے آئی۔ یہاں آغاز میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں داخلہ لیا لیکن پھر اسے ذاتی وجوہات کی بنا پر ادھورا چھوڑ کر اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی چلے آئے۔ یہاں ایم۔اے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سجاد باقر رضوی جیسے اساتذہ نے ان کی غیر معمولی ذہانت، وسعتِ مطالعہ اور ان کے ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انہیں ''شاگردِ خاص'' کا درجہ عطا کیا۔ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے اسی لیے وہ اپنی خوش اخلاقی، خوش خطی اور خوش گلوئی کی وجہ سے کالج کے ممتاز ترین طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ ان دنوں کی ایک خوش کن یاد ''شمع تاثیر'' مشاعرے کے سالانہ مقابلے میں معروف مزاحیہ شاعر انور مسعود کے ساتھ اورینٹل کالج کی نمائندگی تھی، اس مقابلے میں انور مسعود نے نظم اور ڈاکٹر اسلم انصاری نے غزل پڑھی اور انھیں کے لیے رکھی گئی شمع جیت لائے اس غزل کا ایک شعر ان کی فنی پختگی کا آج بھی گواہ ہے:

شرار زندگی بھی کیا چراغ زیرِ داماں ہے
بہاروں میں بھی گل شعلہ بجاں معلوم ہوتے ہیں

.....

اورینٹل کالج کے دنوں میں ہی ان کی ملاقات ناصر کاظمی سے ہوئی جو بعد میں جلد ہی دوستی میں بدل گئی، ڈاکٹر اسلم انصاری نے ابتدائی طور پر ناصر کاظمی کی غزل سے فریاد کون فن کے سانچے میں ڈھالنے کا اسلوب سیکھا، ناصر کاظمی نے کئی برس جونیئر ہونے کے باوجود انہیں اپنا ہم عصر قرار دیا۔ ناصر کاظمی کے شعری مجموعے ''پہلی بارش'' کا نام بھی ڈاکٹر اسلم انصاری نے تجویز کیا۔ اورینٹل کالج میں کچھ عرصہ بطور لیکچرار کے تدریسی امور بھی انجام دیے۔ اسی دوران انہوں نے بی سی ایس کا امتحان بھی پاس کیا لیکن کسی قسم کی کوئی ملازمت اختیار نہ کر سکے۔ ۱۹۶۶ میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ان کا لیکچرار (اُردو) کی حیثیت سے پہلی بار تقرر ہُوا اور جنوبی پنجاب کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۵ سے ۱۹۷۹ تک وہ ملتان آرٹس کونسل کے

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر بھی رہے۔ ۱۹۷۶ میں بطوران کی اسسٹنٹ پروفیسر ترقی ہوئی اور بعدازاں انہیں گورنمنٹ کالج ملتان (بوسن روڈ) بھیج دیا گیا۔ تب سے اپنی ریٹائرمنٹ ۱۹۹۹ تک وہ اسی کالج میں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ معروف شاعر پروفیسر اعتبار ساجد بتاتے ہیں کہ ''میں ۱۹۶۳ میں ڈاکٹر اسلم انصاری سے آشنا ہوں، جب وہ ایک کالج میں خوش پوش لیکچرار تھے اور ٹانگے پر سفر کیا کرتے تھے، وہ بہت عمدہ مترنم شاعر تھے اور بلاشبہ ملتان کے اہم شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا ان کی کہی غزلیں بہت مشہور ہوئی، وہ نہایت ہی نازک مزاج اور ربوط رنج شاعر تھے۔''

ڈاکٹر اسلم انصاری کی شادی ۱۹۷۵ میں نسرین اختر نامی خاتون سے ہوئی اور ان کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئی جن میں قاسم، آصف اور مسعود شامل ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت شاندار طریقے سے گزری۔ وہ حقیقی طور ایک پُراعتماد اور صاف گو آدمی تھے جو کسی کے بچھڑنے پر بھی معصومانہ انداز میں یہی کہتے:

بچھڑتے وقت بہت اعتماد تھا اس میں
اسی خیال سے ہم نے بھی پھر نہ دی آواز

.....

ڈاکٹر اسلم انصاری نے شاعری کا باقاعدہ آغاز ساٹھ کی دہائی میں کیا۔ وہ ایک صاحبِ طرز شاعر، بالغ نظر نقاد، سنجیدہ ماہر اقبالیات اور اہم محقق تھے۔ وہ ہمارے عہد کی پہچان، جدید اُردو غزل کی معتبر آواز اور فارسی، اُردو، انگریزی ادبیات وعلمیات کے شناور تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک پورا ملتان لیے پھرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے شاعری، تنقید وتحقیق، اقبالیات، کالم نگاری اور ڈراما نگاری کے میدان میں خود کو ملتان کی نمائندہ شخصیت کے طور پر منوایا۔ مجھے ان کے اولین شعری مجموعہ ''خواب و آگہی'' پڑھنے کا کئی بار اتفاق ہو چکا ہے جسے ۱۹۸۲ میں ''کاروانِ ادب'' ملتان نے شائع کیا، جو دو سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہیں جس میں ان کی انہتر غزلیں اور ستاون نظمیں شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ خاصی تاخیر کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ جس میں ان کی ابتدائی دور کی غزلوں میں ناصر کاظمی کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ''پاکستانی ادب کے معمار'' سیریز ڈاکٹر اسلم انصاری جس کے مصنف محمد شفیع ہے یہ کتاب ڈاکٹر اسلم انصاری کی شخصیت اور فن کا ہر طرح سے احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر چوبیس پر درج ہے کہ ''یہ وہی غزلیں ہیں جن سے متاثر ہو کر ناصر کاظمی نے ''پہلی بارش'' کے ذریعے اپنے عہد کو سیراب کیا۔ اسلم انصاری کی یہ غزلیں ۱۹۶۲ کے ماہنامہ ''ادب لطیف'' میں شائع ہوئی تھیں۔'' اس شعری مجموعہ میں بہت سی نظمیں مشہور ہوئی،

ان نظموں میں سے ''تمام شہروں میں گفتگو کے چراغ ہم ہیں'' کے عنوان سے یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ'' ہر اہم شاعر کی طرح اسلم انصاری بھی اپنے عہد کی (ذاتی اور اجتماعی) صداقتوں کا شاعر ہے۔ مگر قدرت نے اسے صداقت کے شعری اظہار کا ایسا بے نظیر سلیقہ ودیعت کر رکھا ہے کہ اس عہد کی صداقت اس کی شاعری میں منتقل ہو کر ہر عہد کی صداقت قرار پاتی ہے، دراصل وہ لمحہ موجود یا لمحہ گزراں کو ماضی کی روایات اور مستقبل کے امکانات سے مربوط کے تخلیق شعر کرتا ہے۔ جب اس عہد کی جدید امیجری، جدید علامتیں اور جدید استعارے اسلم کی گہری عصری بصیرت اور آفاق گیر تفکر کے حوالے سے اس کے شعر میں وارد ہوتے ہیں تو اظہار و ابلاغ اور رنگ و آہنگ اور معنی و مفہوم کا وہ معجزہ تشکیل پذیر ہوتا ہے جس کا نام ''خواب و آگہی'' ہے۔''

ڈاکٹر اسلم انصاری کی نظم میں روحِ عصر کی آواز سنائی دیتی ہے جبکہ ان کی غزل میں حرف، لفظ اور ان سے بننے والی تحریر کو بطور موضوع برتا گیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی یہ جہت محض روایت کا حصہ نہیں بلکہ خود اس کی کسی داخلی طلب کی زائیدہ ہے۔ انھوں نے جو غزل میں نقش کھینچے ہیں وہ کسی صورت رایگاں نہیں جانے والے بقول اس شعر کہ:

کوئی مرقع ہستی پڑھے تو اس پہ کھلے
کہ نقش کتنے یہاں رایگاں بنائے گئے

ڈاکٹر اسلم انصاری نے رباعی بھی لکھی۔ وہ اپنی رباعی میں بلند مضامین، نئے خیالات کو دیکھے اور تیز دھار استعاراتی و تشبیہاتی سامان سے سجانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اُردو رباعی میں ایسا منفرد اور جاندار مضمون کم از کم میری نظر سے پہلے نہیں گزرا ہوگا۔

ادراک کے آئینے کو میلا نہ کرو
اس عہدِ درخشاں میں تو ایسا نہ کرو
انسان ہے دنیا کی گراں مایہ متاع
لوگو! کسی انسان سے دھوکا نہ کرو

اقبال شناسی وہ علمی روایت ہے جس کی بنیاد حیات و افکار اقبال کی تفہیم کے سلسلہ میں کی جانے والی اب تک کی کاوشوں کو قرار دیا جاتا ہے اور اقبال شناسی کی روایت سے وابستہ اہلِ علم کو اقبال شناس، اقبال سکالر یا ماہر اقبال کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری ہماری فکری تہذیبی روایت کے تخلیقی تسلسل کے صاحبِ اسلوب شاعر اصیل فکر دانشور، عمیق محقق اور ایک متوازن اقبال شناس تھے۔ اس حوالے سے جلیل القدر لکھاری جلیل عالی رقم طراز ہے کہ'' انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے بہت وقیع تحقیقی

مقالات بھی تحریر کیے اور اپنے منفرد اسلوب میں اس کے شعر و فکر کی حرکی تفہیم کے زوایے بھی اُجاگر کیے۔ صوفیانہ مزاج رکھنے کی وجہ سے ان کی تجزیاتی مطالعات میں کلی تصورِ صداقت کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ ہمارا بہت قیمتی تہذیبی اثاثہ تھے۔''

ڈاکٹر اسلم انصاری کی دیگر تصانیف میں Kafees کے عنوان سے خواجہ غلام فرید کی منتخب کافیوں کا انگریزی ترجمہ (بہ اشتراک جیلانی کامران)، خواب و آگہی (شعری مجموعہ)، اقبال عہد آفرین (اقبالیات)، نقش عہد و صال کا (شعری مجموعہ)، فیضانِ اقبال (منظوم اقبالیات)، چراغ لالہ (فارسی مثنوی)، شعر و فکرِ اقبال (اقبالیات)، تکلمات (ادبی کالم)، بیری وچ دریا (سرائیکی ناول)، نگارِ خاطر (فارسی مثنوی)، ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت (تنقید)، اردو شاعری میں المیہ تصورات (مقالہ ڈاکٹریٹ)، چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی'' سوانح اور فکری و فنی مطالعہ (تنقید و تحقیق)، شبِ عشق کا ستارہ، شیشوں کی اوٹ میں (افسانے)، تحریر نغمہ، تاریخ و تہذیب (تنقیدی، تاریخی و تحقیقی مضامین) وہ دیگر شامل ہیں۔ ان کا کلیات شعر و فارسی ''گلبانگِ آرزو'' کے نام سے اکادمی ادبیات پاکستان نے شائع کیا اور اس کی تعریفی تقریب ان کی آخری ثابت ہوئی۔

ان کی علمی، ادبی خدمات کے اعتراف میں بہت سے اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے جن میں حبیب بینک ادبی ایوارڈ، خواجہ فرید ادبی ایوارڈ، احمد ندیم قاسمی ایوارڈ، فیض احمد فیض ایوارڈ، ملتان ایوارڈ (ثقافت)، لوحِ تقدیس بہ انضمام سکہ طلائی (فارسی شاعری)، ریڈیو پاکستان گولڈن جوبلی ایوارڈ، خواجہ فرید ایوارڈ (اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)، اعزاز برائے حسنِ کارکردگی (شعبہ ادب) ضلعی حکومت ملتان اور تمغہ حسنِ امتیاز حکومت پاکستان قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو کے مختلف رسائل و جرائد میں بیاسی کے قریب تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کے اعزازت میں ان کی شخصیت اور فن پر کئی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری جیسی کثیر الجہت تخلیقی شخصیت کا انتقال ۲۲ اکتوبر ۲۰۲۴ کے دن ہُوا۔ جن کے بچھڑ جانے سے ہماری ادبی و فکری دنیا میں ان کی موجودگی کا خلا دیر تک محسوس کیا جاتا رہے گا۔ آخر میں ان کی شہرۂ آفاق غزل کے ان اشعار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے:

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

☆☆☆☆

عہدِ حاضر میں مزاحمت کا استعارہ: فرحت عباس شاہ

ہر ناپسندیدہ بات اور حالات کے خلاف مزاحمت انسانی فطرت کا مطالبہ ہے' کوئی بھی ذی شعور اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

مزاحمتی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جو کسی بھی طرح کے ظلم کے خلاف تخلیق کیا گیا ہو۔ انسانی زندگی میں مزاحمت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی جبر کی۔ جب کبھی سماج میں جبر اور ظلم و ستم کا دور دوراں ہو باضمیر ادیب اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں:

کسی دھرنے نہ کسی دھونس نہ میخانوں سے
انقلاب آتے ہیں مظلوم کی شریانوں سے

لے گیا چھین کے تو آج جمع پونجی بھی
ٹیکس کے نام پہ ہم سوختہ سامانوں سے

.....

فرحت عباس شاہ صاحب کے ان اشعار کے تناظر میں یہ بات مزید بہتر سمجھ آتی ہے کہ ہر انسان ظلم و استحصال کو ایک خاص حد تک برداشت کرتا ہے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ اس نظام، روایت اور قدروں سے بغاوت کرتا ہے جو کہ اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں:

وہ جو کہتے تھے وطن جان سے پیارا ہے ہمیں
ان سبھی نے بڑی ذلت سے گزارا ہے ہمیں

.....

کوئی بھی فطری شاعر اپنے اردگرد کے موجود حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ حقیقی ادیب اور شاعر اپنے سماج پر گہری

طلحہ غفور

نظر رکھتا ہے اور کسی بھی نوعیت کی ہونے والی تبدیلی کو عام لوگوں کی نسبت شدت سے محسوس کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں امن و آشتی اور مساوات کا خواہاں رہتا ہے:

کسی مظلوم کی اجڑی ہوئی آنکھوں میں اگر اشک آوے ہے تو بیمار کی یاد آوے ہے

.....

میں اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ مزاحمتی شاعر حالات کے دباؤ میں نہیں آ سکتا۔ وہ ہمیشہ اس قابل ہوتا ہے کہ ناموافق حالات میں بھی اپنا کام مکمل فوکس کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اگر کبھی حالات اتنے ناسازگار ہو جائیں کہ نہ وہ کچھ اقدام کر سکے اور نہ بول سکے تو اس صورت میں بھی وہ دل میں ناپسندیدہ حالات پر کڑھتا اور رنجیدہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اسی تناظر میں یہ اشعار دیکھیے:

بعد آنکھوں کے مرا دل بھی نکالا اس نے
اس کو شک تھا کہ مجھے اب بھی نظر آتا ہے

ایک اور نوحہ پڑھیے:

پھاڑوں نہ گریبان ، دمادم نہ کروں میں
احساس کو اظہار سے باہم نہ کروں میں

میں روز اٹھاتا ہوں کسی خواب کی میت
اور آپ یہ کہتے ہیں کہ ماتم نہ کروں میں

صد حیف جو مظلوم کی آواز نہ بن پاوں
صد حیف اگر شعر کو پرچم نہ کروں میں

.....

عہدِ موجود میں اہلِ فلسطین ہوں یا اہلِ کشمیر دونوں کی حق تلفی ہوئی ہے اور دونوں کو مزاحمت کا حق ہے۔ اس سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔

دنیا کے کسی بھی خطے میں بیٹھے فطری شاعر کو اس بات کا ادراک ہے اور وہ اپنی علاقائی زبان اور اپنی ادبی صنف میں اپنے مزاحمتی خیالات کا اظہار کر رہا ہے

شاد صاحب کے یہ اشعار بھی دیکھیے:

یہ جب بھی جعلی کوئی بادشہ بناتے ہیں
دراصل ایک نئی ابتلا بناتے ہیں

ہمارے ذہنوں کی تخریب کے لیے فرحت
یہ وقفے وقفے سے اک حادثہ بناتے ہیں

.....

وطنِ عزیز کا اول روز سے یہ المیہ رہا ہے کہ یہاں عوام کو سازگار حالات میسر نہیں آ سکے البتہ اشرافیہ اور مقتدرہ ہمیشہ سے ہی بالاتر رہے ہیں۔ قانون اور انصاف کسی بھی فرد اور معاشرے کی بقاء کے لیے انتہائی ضروری ہیں مگر المیہ دیکھیے کہ یہاں عام آدمی کو جیتے جی وہ بھی میسّر نہیں۔ صحت تعلیم اور روزگار جیسی بنیادی انسانی ضروریات پر بھی چند لوگوں کا

قبضہ دکھائی دیتا ہے۔

ممکن تھا جتنا ، حشر اٹھایا گیا ، سمجھ
جمہوریت کو کھیل بنایا گیا سمجھ

جکڑا گیا ہے قرضوں کے بے رحم جال میں
یہ کام کس سے کیسے کرایا گیا سمجھ

کب کس طرح سے کونسے مقصد کے واسطے
کس کس کو اقتدار میں لایا گیا سمجھ

.....

ایسے حالات میں کوئی فطری اور حقیقی شاعر کیسے صرف لب و رُخسار، ہجر و فراق، سرکار و دربار اور جینز جیسی شاعری تک محدود ہو سکتا ہے

بقولِ فرحت عباس شاہ:

مرے لہو کا ہر ایک دھبہ مٹا دیا جاتا ہے ہمیشہ
یہ احتیاطیں نئی نہیں ہیں یہ بھل صفائی نئی نہیں ہے
دجالیوں اور یزیدیوں سے بہت پرانی عداوتیں ہیں
ہمارے بچوں کو بھی پتہ ہے کہ یہ لڑائی نئی نہیں ہے

.....

فرحت عباس شاہ دنیائے شعر و ادب میں ایک بے بہا تخلیقی وفور کا نام ہے اُن کا شعری مجموعہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' بے پناہ تخلیقی قوت کے ساتھ جبر و استبداد میں دبی پسی عوام کے حقوق کی نظریاتی شاعری پر محیط ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مزاحمت ہے اشرافیہ کے خلاف مزاحمت ہے ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت ہے ایسی مزاحمت جس سے دبی گھٹی عوام کو سوال کرنے کی مزید تحریک ملتی ہے۔

مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

جو رات کو عدالتیں لگا گیا وہ کون تھا
گماشتوں کو تخت پر بٹھا گیا وہ کون تھا

جو قاتلوں کو ڈاکوؤں کو اپنے اختیار سے
مرے وطن کے حکمراں بنا گیا وہ کون تھا

اک آخری چراغ تھا تمام شہر میں یہاں
اک آخری چراغ بھی بجھا گیا وہ کون تھا

ہمارے آنسوؤں سے بھوک بہہ رہی ہے آج کل
وہ کون تھے جو رزق سب کا کھا گیا وہ کون تھا

.....

ایسے زوال شدہ معاشرے میں جہاں شعرا برس ہا برس سے سرکار دربار سے حاصل مراعات کی خاطر ''سب اچھا'' کے قصیدے لکھ رہے ہوں۔ جہاں کالجز یونیورسٹیوں کے مشاعروں کی فضا شور و غل سے آلودہ ہو۔ جہاں نک ٹاکرز بے ہنگم اردو کے جملے بول کر شاعری کا جنازہ نکال رہے ہوں جہاں صاحبانِ علم و ہُنر خوف زدہ دکھائی دیں۔ جہاں میڈیا آزاد نہ ہو۔ جہاں سوشل میڈیا کا استعمال بھی ادبی لابیز اور گروہوں کے مقاصد کے

حصول کے لیے کیا جاتا ہو اور کوئی بھی شاعر ادیب اپنی ڈبل پالیسی کے باعث علمی و تحقیقی مکالمے اور اختلاف رائے سے ڈرتا دکھائی دے۔ جہاں کوئی بھی شاعر اپنی ریچ اور فالورز کی کمی کے خوف سے سماجی و ادبی بدد یانتیوں پر بات کرنے سے کترائے۔ جہاں ادبی گروز کی سرقہ بازی پہ بات کرنا جرم شمار ہوتا ہو۔ جہاں حقیقی شاعر کی جگہ شوقیہ خریدار شاعر ادبی روایات کا داعی بن بیٹھے۔ جہاں لفظ نظریہ صرف مطالعہ پاکستان کی کتاب میں ایک تعریف سے زیادہ کچھ نہ ہو:

وہ چاروں سمت سے تنظیم کر کے مارتے ہیں
ہمارے جیسوں کو تقسیم کر کے مارتے ہیں

مذاکرات کے پھندے لگا کے ہیں رکھتے
معاہدات کو تسلیم کر کے مارتے ہیں

شقیں بناتے ہیں پہلے اٹل تسلط کی
پھر ان شقوں میں بھی ترمیم کر کے مارتے ہیں

.....

اسی المیے کے ساتھ مزید اشعار دیکھیے:

وہی ہے جبر، وہی بے بسی ہماری ہے
وہی خدا ہیں، وہی بندگی ہماری ہے

شکم کی آگ کے آنکھوں سے بہہ نکلنے میں
کسی کا دوش نہیں کج روی ہماری ہے

تمہارے ظلم کا انجام ہونے والا ہے
ہمیں یقین ہے اگلی صدی ہماری ہے

.....

ایسے معاشرے اور سماج کے لیے فرحت عباس شاہ کا شعری معنویت و مقصدیت سے بھرپور شعری مجموعہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' ایک بڑا اہم نئے اور اچھوتے اسلوب کا شعری مجموعہ ہے جس میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر عوام کے معاشرتی اقتصادی اور سماجی مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مثلاً:

یہی ہے رسم یہی ہے نظام دنیا میں
اُدھر ہیں خاص ادھر ہیں عوام دنیا میں

ہوں بادشاہتیں، جمہوریت یا وردیت
سبھی کا ایک ہی ہوتا ہے کام دنیا میں

.....

جدید دور میں طاقت کے تبدیل ہوتے ذرائع اور زیادہ سے زیادہ طاقت اور اثر و رسوخ کے نشہ میں دھت ممالک کس طرح عوام کو نت نئی بیماریوں، کبھی اسلحہ کی دوڑ تو کبھی تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کبھی معیشت کے ذریعے کنٹرول کرنے کی منصوبہ بندی کیے بیٹھے ہیں۔

اس سارے پیٹرن کو بھی وہ اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

سعودیہ سے یا لندن سے تل ابیب تلک
عذاب بھیج دیا کس نے ہر غریب تلک

تو اس کے جال میں کب تک پھنسا رہے گا بتا
کچل کے رکھ دیا جس نے ترا نصیب تلک

.....

فرحت عباس شاہ کا شعری مجموعہ ''مزاحمت کریں گے ہم'' فیض احمد فیض کے شعری مجموعوں ''دست صبا'' ''زنداں نامہ'' ''نقش فریادی'' اور حبیب جالب کے ''ذکر بہتے خون کا'' اور ''حرفِ حق'' کی طرح انقلابی اور آفاقی شعری مجموعہ دکھائی دیتا ہے۔
آج کے دور میں ادب کے سنجیدہ طالب علم کو ایسے بھرپور شعری مجموعے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ شعری مجموعے سے مزید کچھ انتخاب حاضر ہے:

ابھی ابھی یہ کہیں رس رہا تھا زخموں سے
اور اب یہ غم مرے گلدان سے ٹپکنے لگا

تمہارے بعد میں بیمار ہو گیا فرحت
تمہارا ہجر مری جان سے ٹپکنے لگا

سب راستے دشمن ہوئے اشجار مخالف
تو میرا ہوا ہے تو ہوئے یار مخالف

میں تو کسی قابل ہی نہیں تم کو سمجھتا
تم میرے بنے پھرتے ہو بیکار مخالف

ہم لوگ غریبوں سے الجھتے نہیں فرحت
ہم لوگ بنا لیتے ہیں سردار مخالف

بچا کھچا مرا سامان لے کے چھوڑے گا
یہ سامراج مری جان لے کے چھوڑے گا

ہر ایک سمت سے یلغار کر کے ڈالر کی
ضمیر مارے گا، ایمان لے کے چھوڑے گا

اسے قبول نہیں ہے ہماری حیرت بھی
ہمارا دیدۂ حیران لے کے چھوڑے گا

وہ میری ریڑھی پہ بندش لگائے گا اک دن
وسیلہء زرِ آسان لے کے چھوڑے گا

عدالتوں کو بٹھائے گا سینہء شب پر
چراغِ کوچہء ویران لے کے چھوڑے گا

ہے جس نے بھی مرے گھر کو کیا ہوا اغوا
یہ صاف بات ہے تاوان لے کے چھوڑے گا

کسی کے ہاتھوں سے چھینے گا رزق کے موتی
کسی کے ہاتھوں سے گلدان لے کے چھوڑے گا

ہزار خوف اتارے گا آرزوؤں پر
نحیف سا دلِ نادان لے کے چھوڑے گا

ہمارے خوابوں کو جھونکے گا آگ میں فرحت
ہمارے بچوں کے ارمان لے کے چھوڑے گا

☆☆☆☆☆

حقیقت پسند نسائی آواز کی علمبردار ''کشور ناہید!

ہاں انہی گزرے زمانوں کے صدا ساز ہیں ہم
جن کے شعلوں پہ ہوا ناچتی دیکھی ہم نے

.....

کشور ناہید ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ، نمایاں مقام رکھنے والی بہادر، خود مختار، ایک حساس دل کی ملکہ اور روایتی مردانہ آوازوں کے غلبہ والے میدان میں، اُردو زباں میں تحریر کرنے والی، ایک نئی مخصوص طور پر نسائی آواز کی علمبردار تھیں۔ آپ نے تیس سالوں کے دوران ایک ایسے کام کو انجام دیا جو اختری، منحرف، سیاسی اور خود آگاہ ہے۔ آپ کی شاعری نے خواتین جنسیت، سیاست اور سماجی مسائل سے اب تک کے بے نامی شعبوں کو شامل کرنے کے لیے طے شدہ ''نسائی'' دائروں سے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔ ایک ہندوستانی اخبار ''دی ہندو'' میں اپنے جذبات کی عکاسی اور اپنی سوچ، اپنے خیالات کی وضاحت کرتی ہوئیں 'مرد اور عورت' کے باہمی تعلقات کی نئی وضاحت کے لیے ایک بنیاد پرست، غیر روایتی یا غیر رسمی، مطلق العنان، ذی اختیار، داغ زدہ سکہ مرتب کئے جانے کو مسترد کرتی ہوئیں خود کو ''حقیقت پسند قرار دیا، خود کو حالات کے ساتھ مردوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے سے انکار کیا اور ان مظلوم خواتین کے مجروح جذبات کی دلیرانہ تحریر اور انقلابی فکر کو اپنے لہو کے

جی ایم پٹیل

قطروں سے تحریر کردہ مضامین جس میں تانیثی رجحان، پُرکشش انداز کو قلم دل میں ڈبونا اور تب لکھنا' یہ عمل آپ کی تحریروں میں عیاں رہا جو مصنفین کی نسبت آپ کی ایک مخصوص شناخت نے قاری کے ذہن پر مقناطیسی اثر چھوڑ دیا جو قائم دائم رہا۔

میں ایک ہاتھ سے دیوار کیسے تھاموں گی
لہو میں غرق ہے دست دعا نیام تلک

.....

1940 میں بلند شہر میں ایک قدامت پسند سید گھرانے میں اتر پردیش ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد محترم جو راج گھاٹ نرودہ کے مینجر تھے۔ آپ کے نانا محترم فضل الرحمٰن وکالت کرتے تھے اور لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ لیکن ضدی اور انقلاب پسند کشور ناہید روایتوں سے ہٹ کر اپنی زندگی کے تمام فیصلے کئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کالج میں داخلہ لیا، اپنے والدین کی شدید مخالفت کے باوجود کالج کے پہلے ہی سال سے شاعری کرنا، تقریروں، ڈراموں مقابلوں، مشاعروں میں حصہ لینا جاری رکھا اور آپ کے لکھے کافی کلام اس وقت کے مشہور ادبی رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔

برِصغیر کی تقسیم کے بعد کچھ مہینوں میں آپ کا خاندان بلند شہر سے لاہور منتقل ہوا۔ آپ نے ایک ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کی جدو جہد کے لیے خوب محنت، مشقت و حالات اور شر پسند عناصر کا مقابلہ کرنا پڑا جہاں تعلیم حاصل کرنے لیے سکول جانے کی سخت مخالفت تھی۔ سختیوں، روایتی رسموں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آپ نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی اور خط و کتابت نصاب کے ذریعے ہائی سکول کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ لیکن کافی جدو جہد، اپنے انقلابی ارادوں، وترقی پسند ذہن کی بدولت 1959 میں پنجاب یونیورسٹی سے 'معاشیات' میں ماسٹرز ڈگری' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ آپ کے 'بھائی سید افتخار' نے اپنی ذمہ داری سے ٹیوشن کے اخراجات ادا کئے اور آپ کی رسمی تعلیم جاری رکھنے میں مدد کی۔ اپنے عزیز اور ہمدرد 'جناب یوسف کامران' جو شاعر تھے ان سے کالج کے زمانے میں ملاقاتوں اور عشق کی خبریں والدین ہی نہیں سارے معاشرے کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں کشور ناہید اور یوسف کامران کا نکاح پڑھوا دیا۔ ازدواجی حالات خوشگوار تو نہیں تھے لیکن دو صاحب زادوں کے والدین بن گئے۔ کامران یوسف کا انتقال 1984 میں ہوگیا۔ شوہر کی

موت کے بعد آپ نے اپنے بچوں کی پرورش اور خاندان کی کفالت کے لیے سرکاری نوکری قبول لی۔

کشور جس معاشرے میں جی رہی تھیں، وہاں مرد نے ہمیشہ عورت کو دو صورتوں میں پیش کیا ہے، یہ شکلیں چڑیلیں، بدروح مائیں، دیویاں، عائنہ، مسیحا صفت پیکر، انصاف دہندہ خواتین یعنی سیاہ اور سفید دونوں رنگوں میں عورت ذات، عورت کا درجہ مرد سے بلند و اعلیٰ رکھا۔ آپ اس صورت حال کو انتہائی شدت سے محسوس کیا، پدرانہ نظام میں اپنی ذات کو لوہا منوانے کے لیے سخت ریاض، جدو جہد کرتی رہیں، اپنے آزاد خیال اور اپنی انقلابی سوچ، اپنے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ سے اتنا وسیع اور عمیق اور ایک منفرد زنانہ آزادی کی بات کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرنے میں قدرت حاصل کی۔ ثبوت کے طور پر پراد بی دنیا کو اپنی عمدہ، اعلیٰ وقار اظہار کو اپنی معیاری تخلیقات کو کتابوں کی بیش بہا سوغات پیش کی۔ آپ کے لہجے کی ایک للکار، خاتون کی جسمانی مشقت، ذہنی غلامی اور معاشی استبداد کے خلاف تھی۔

سہمی ہوئی دبکی چڑیو یہ تم ان سہمے لرزتے ہاتھوں سے کیوں خوف زدہ ہو

تم تو پھر بھی انجانے میں جال میں پھنس کر، آزادی کی لذت سے محروم ہوئی ہو

ہم تو خود ہی اپنی زبانیں کاٹ کر، سرخ روئی کے احراموں میں لپٹے سجدہ گزار ہی محو ثنا ہیں۔

آپ نے مختلف قومی اداروں میں بڑے عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ اپنے صنعتی عہدے سے سخت نالاں ہے جس میں صنعتی گماشتوں نے محبت کو صنعت میں ڈھالنے کی انتھک کوشش کرتی ہوئیں اس میں نسوانیت کا خوب استعمال کیا اور اس صنعتی اور سرمایہ دار معاشرے میں تکنیکی، عمرانی، ذہنی اور جذباتی منقولات کو مشتہر کر کے خاتون کو اشتہار بازی کا لازمی جزو بنا دیا اور چشم زدن میں خاتون کی نسوانیت اشتہاراتی میدان میں پیداوار کا درجہ اختیار کر گئیں۔

اپنے کندھوں پر اپنے ہم نفسوں کا بوجھ اٹھائے عہد حاضر کی خواتین کو نیا عہد نامہ کی تخلیق کی جو ایک یادگار کی صورت آنے والے عہد کو سونپ دیا۔ تاکہ ایک خاتون اپنی خدا رزندگی بسر کر سکے نہ کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارنہ معاشرے میں اگر بیوی بن کر اپنی ذات کا اثبات نہ کر پائی تو محلات کی لونڈی یا بازار حسن کی زینت بن کر زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اپنی شاعری کو آج کی آزاد طلب عورت، اپنے وجود کا

اثبات چاہنے والی خاتون اور اپنی نسوانیت سے نہ شرمانے والی خاتون کا منشور بنا دیا اور ان دیواروں کی سخت دشمن رہیں جن میں باہر کی طرف کوئی کھڑکی نہیں کھلتی۔ آپ کا رویہ مشرقی خاتون کی روایتی صف سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کیں، سینہ سپر رہنے اور زندگی کو مجاہدانہ بسر کرنے کی خوگر، عادی بن گئیں اور یہ مزاحمتی رویہ محض جذباتی کیفیت کا حامل نہیں بلکہ تجزیاتی عمل سے گزر کر سچائی تک پہنچنے کی عبارت تھا اور خواتین کے حقوق کی جنگ خود مختاری یا فحش کہلوانا نہیں تھا بلکہ مقصد انتخاب، تول پرکھ اور عملی توجیہات تمام موقعوں پر عورت مرد ایک ہی سطح رکھنا تھا اور خاتون کا درجہ سماج میں بلند رکھنا یہی تھا اور اس ضمن میں اپنی تحریروں، جلسوں اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں پدرانہ نظام کی نقاب کشائی تھا۔

جنوبی ایشیا میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور سوشلزم کے نظریات سے متاثر آپ نے بڑے بین الاقوامی سیاسی اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کیا ملک میں مارشل لا کی زد میں اردو ادب میں نت نئے خیالات اور شکلیں متعارف اور پذیرائی ہو رہی تھیں۔ تمام راٹرس ہر چیز میں الجھ گئے تھے۔

آپ نے مختلف قومی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہیں۔ اور اپنے خدمت انجام دیں۔ ان خدمات سے سبکدوشی سے قبل 'نیشنل کونسل آف آرٹس' کی ڈائریکٹر جنرل تھیں۔ آپ ایک سرکاری ملازمت میں قریب 38 سال تک پیروی کی۔ 1983 میں خواتین مظاہرین کے ساتھ شواہد کے کے مجوزہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے پر مختصر طور پر قید رہیں جو خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک تھا۔ کشور نے نے اپنی چھٹی کا استعمال خواتین مین گھریلو مفت صنعتی کاروبار کو فروغ دینے اور ملک کے دور دراز علاقوں میں دستکاریوں کی بازیافت کے کئے خوب جدوجہد کی۔ 1998 میں فلسفے کئے بطور منیجر کے ملازم تھیں آپ اپنی ملازمت سے اسے استعفیٰ دے دیا۔ اسلام آباد میں ایکشن ایڈ اور ایشیائی ترقیات بینک کے ساتھ مشیر کے طور بھی اپنے خدمات انجام دئے ہیں۔

ماہنامہ 'دی ہیرالڈ' کو دئے گئے ایک ملاقات میں ناہید نے سنسر شپ پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ نظمیں شاعر کے اندرونی احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تخلیقی صلاحیتوں کو منظم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ ایک ایسی خاتون مصنفہ یا فنکارہ سے

بہتر کون جان سکتا ہے جسے آپ محسوس کرتی ہیں اور جو سوچتی ہیں اسے بیان کرنے کے قابل ہونے کے لیے آپ کو ساری زندگی جدوجہد کرنی پڑی ہے، دنیا کے سامنے جو وہ منفرد انداز میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ لکھنے اور اظہار کرنے کی یہ آزادی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔

کشور ناہید نے جنوبی ایشیا میں امن کے مقصد میں بھی کامیاب رہیں اور SAARC مصنفین فورم کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا۔ آپ نے عالمی ادبی اور ثقافتی تحریکوں میں حصہ لیا جس میں ایسے مصنفین اور فنکاروں کو اکٹھا کیا جو ایک منصافانہ اور مساوی عالمی سیاسی نظام پر یقین رکھتے۔ انتہا پسند مذہبی سوچ، تشدد، دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی وجہ سے خواتین اور لڑکیوں کے بڑھتے ہوئے مصائب کے خلاف ان کی طاقتور نظموں نے مقامی اور بین الاقوامی سطح پر لہریں پیدا کیں۔

کشور ناہید کی شاعری کل 12 جلدیں پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں شایع ہوئیں ہیں۔ آپ کی اُردو شاعری دنیا بھر کی غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازایں کشور ناہید نے بچوں کے لیے آٹھ کتابیں لکھیں جس کے لیے آپ کو، بچوں کے ادب کے لئے ''یونیسکو کا باوقار ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ بچوں سے آپ کی بے لوث محبت کی مثال قائم کی جس کا اظہار آپ نے اپنی نظم

Asin Burien We Doko

میں کیا ہے۔ موجودہ مردانہ تسلط والے معاشرے میں خواتین کی حالت زار دل کو چھو لیتی ہے۔

قصہ کام و دہن کا غم مطلوب بنا
خوب و ناخوب بنا
حرف ناگفتہ
مگر ذہن کا آزار بنا
دل کی دیوار بنا
راہ دشوار بنا

ایک باوقار ادبی رسالہ ''ماہ نو'' کی تدوین کی اور ایک تنظیم 'حوا' کی بنیاد رکھی جس کا عین مقصد خواتین کو 'گھریلو صنعتیں اور دستکاری' کی فروخت کے ذریعے مالی طور پر خود مختار بننے میں مدد کا باعث بنیں اور آپ جدوجہد اور امنگوں کی گواہ رہی ہیں۔ چار دہائیوں سے زیادہ پر محیط آپ کا ادبی، تخلیقی اور شہری میدانوں میں مصروف ایک خاتون مصنفہ کے طور پر آپ کے تجربات بیان کرتا ہے، یہاں تک کہ آپ نے اپنی ذاتی، سماجی اور سرکاری ردعمل سے نمٹا ہے۔

1969 اور 1990 کے درمیان نظموں

کے چھ مجموعے لکھے۔ آپ کا پہلا مجموعہ
'لب گویا' 1968 میں شائع ہوا اور
1969 میں ادب کا باوقار سرکاری اعزاز
''آدم جی'' سے آپ کو نوازا گیا۔ روایتی
غزلوں کے اس مجموعے کے بعد نظموں کا
مجموعہ، غیر ملکی شاعری کے تراجم اور آزاد نظم
میں بہت سی تحقیقات شامل ہیں۔ آپ نے
بچوں کے لیے اور 'روزنامہ جنگ' کے لیے
بھی لکھا۔ 1994 میں اپنی سوانح عمری
شائع کی جو ہندوستان میں شائع ہوئی۔
2001 میں آپ کا شاعری کا مجموعہ
1312 صفحات کے حجم میں ''دشتِ قیس
مر دلیلیٰ'' کے عنوان سے جاری ہوا۔ جنگ
میں آپ کے روزنامہ کالم میں اکٹھا کئے گئے
اور شائع ہوئے ۔ آپ کی شاعری کا
انگریزی اور ہسپانوی زبان میں ترجمہ اور
تدوین کیا گیا۔ آپ کی 'مشہور زمانہ نظم'' ہم
گنہگار عورتیں'' ہم عصر اُردو نسوانی شاعری
کی ایک راہ توڑنے ولی' ترانہ'' کی سوغات
سارے زمانے کو سونپ گئی۔ جس پدرانہ
نظام نے عورت کی شخصیت کچل کر اسے
ذلیل وخوار کر کے معاشرے میں انتہائی
پست مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔
اس حوالے سے آپ کی مشہور زمانہ نظم'' ہم
گنہگار عورتیں'' کے چند اشعار

یہ ہم گنہ گار عورتیں ہیں۔
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں، نہ سر جھکائیں، نہ ہاتھ جوڑیں
'کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں' نیابت امتیاز ٹھہریں'
وہ داورِ اہل ساز ٹھہریں
'کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں
'کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
'کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا
ہم گنہ گار عورتیں -----!

اعزازات

1969 ملک کا عظیم و نایاب اعزاز'' آدم
جی ایوارڈ۔ اوّلین شعری مجموعہ ''لب گویا''
یونیسکو ادب برائے'' اطفال اعزاز'' '' دیس
دیس کی کہانیاں''
1997 کولمبیا یونی ورسٹی بہترین مترجمہ
منڈیلا ایوارڈ
2000 ملک ما مقبول ترین قومی اعزا
''ستارۂ امتیاز''

☆☆☆☆☆

دلشاد نظمی کا شعری مجموعہ ___ ''کوئی ایک لمحہ رقم نہیں''

دلشاد نظمی کی غزلوں کا مجموعہ، کوئی ایک لمحہ رقم نہیں، ایک سحر انگیز مجموعہ ہے جو قارئین کو اردو شاعری کے حقیقی رنگ سے متعارف کراتا ہے، پروفیسر سید اشہد کریم کے دیباچے اور ڈاکٹر قاسم خورشید کے تعارف کے ساتھ یہ شعری مجموعہ صرف غزلوں کا مجموعہ نہیں بلکہ جذبات، تجربات اور انسانی حالت کی گہرائی کی تصویر پیش کرتا ہے۔

پروفیسر سید اشہد کریم اپنے تمہیدی کلمات کے ساتھ اس شعری مجموعے کے سٹیج کو خوبصورتی سے ترتیب دیتے ہیں اور قارئین کو نظمی کے شعری اظہار کی اہمیت اور گہرائی کی ایک واضح تصویر کچھ یوں پیش کرتے ہیں کہ عصری دور میں غزل کی پائیدار مطابقت اجاگر ہو جاتی ہے اور اس طرح ثقافتی رکاوٹوں کو عبور کرنے اور قارئین کے دلوں کو چھونے کی غزل کی صلاحیت واضح ہو جاتی ہے، ڈاکٹر قاسم خورشید کا تعارف دلشاد نظمی کی شاعری کی دنیا میں ایک فکر انگیز داخلے کا کام کرتا ہے۔ گہری بصیرت کے ساتھ ڈاکٹر قاسم خورشید نے نظمی کی غزلوں کی موضوعاتی فراوانی کو کھوج نکالا ہے اور اس طرح غزل میں پوشیدہ معنی اور علامت کی پیچیدہ تہوں کو بے نقاب کیا ہے، ان کے تجزیئے کے ذریعہ قارئین نظمی کے فن کی باریکیوں کو اور شاعری میں سمائے ہوئے آفاقی سچائیوں سے بخوبی متعارف ہوتے ہیں، جیسے ہی کوئی اس شعری مجموعے کی قرأت کے مرحلے سے گزرتا ہے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نظمی کے اشعار محض شعری اظہار نہیں ہیں بلکہ روح کے دریچے ہیں، ان کی غزلوں میں صرف خام جذباتیت نہیں بلکہ محبت سے لے کر مایوسی اور خود شناسی کے بے شمار احسانات کی تصویر کشی ہے، ہر شعر اپنے طور پر ایک شاہکار ہے جو شاعری اور منظر کشی پر پوری توجہ کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔

نظمی کی شاعری موضوعات کا ایک وسیع سلسلہ، قطار یا صف پر محیط ہے ہر ایک موضوع کو گہرائی اور باریک بینی کے ساتھ تلاش کیا ہے ان کی شاعری کے مرکزی

نسترن احسن فتیحی

موضوعات میں سے ایک محبت ہے، جسے وہ مختلف شکلوں میں دریافت کرتے ہیں اپنی غزلوں میں دلشاد نظمی اکثر محبت کو ایکسٹیسی اور اذیت دونوں ذریعہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جو انسانی جذبات کے دوہرے پن کو اُجاگر کرتے ہیں، ان کی بے مثال محبت، آرزو اور علیحدگی کی تصویریں ثقافتی اور وقتی ادوار میں قارئین کے ساتھ رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہیں،

عجب سا حبس ہے دلشاد ہر سُو بے نوائی کا
لپٹ کر پتیوں سے کیوں ہوا خاموش بیٹھی ہے

جو بھی بخشی ہوئی بیساکھوں پہ ہیں کھڑے
وہ اپاہج اب مری رفتار طے کرنے لگے

دلشاد نظمی کی شاعری کا ایک اور نمایاں موضوع وجودیت اور انسان کو درپیش وجودی بحران ہے، دلشاد نظمی اپنی انوکھی غزل کے ذریعے شناخت۔ فانی اور زندگی کی عارضی نوعیت کے سوالات پر غور کرتے ہیں، وہ انسانی حالت کی پیچیدگیوں اور موت کی ناگزیریت کا کھوج لگاتے ہوئے وجود کے تصور سے خود کو جوڑتے ہیں، دلشاد نظمی کا وجودی نقطہ نظر اداسی اور مایوسی کے احساس سے متصف ہے، کیونکہ وہ انسانی وجود کی نزاکت کا سامنا کرتے ہے،

میں گونگوں کے اشاروں پر بہت ہنستا تھا، کچھ دن سے
کئی بے ربط آوازیں مرے اندر سے آتی ہیں

رستہ بھی دیکھتا ہے مرے پاؤں کی طرف
لے جانا چاہتی ہے تھکن چھاؤں کی طرف

اس شہرِ بے پناہ کی گلیوں میں کھو گئی
جاتی تھی ایک کچی سڑک گاؤں کی طرف

دلشاد نظمی کی شاعری گہری روحانی بصیرت اور روحانی روشن خیالی کی جستجو کی بھی عکاسی کرتی ہے، صوفی فلسفہ اور اسلامی تصوف سے متاثر دلشاد نظمی کے اشعار میں اکثر صوفیانہ تصورات اور استعارے ہوتے ہیں، جو گہری روحانی سچائیوں کو بیان کرتے ہیں، وہ الٰہی محبت ماورائی اور افراتفری کی دنیا میں معنی کی تلاش کے موجوعات کو تلاش کرتا ہے دلشاد نظمی کا روحانی سفر الٰہی کے ساتھ ملاپ کی آرزو اور روحانی تکمیل کی تڑپ سے نشان زد ہے:

سورج کی کرنوں سے اغوا ہونے والا کھارا پانی
آبادی میں گھوم رہا اب گدلایا بنجارہ پانی

میں نہ کہتا تھا کہ ضبط کی خوش فہمی کچھ ٹھیک نہیں ہے
دیکھ ذرا سا بند کھلا اور پھیل گیا آوارہ پانی

آگ کی لپٹیں ناچ رہی ہیں دجلہ والوں کی بستی میں
پیاس کے مارے چیخ رہا ہے روز فرات کا سارا پانی

حمد و ثنا رب العزت کی ناممکن دلشاد;207; ہے گرچہ
سارے پیڑ قلم بن جائیں اور سیاہی سارا پانی

اسلوب کے لحاظ سے دلشاد نظمی کی شاعری اس کی لسانی وسعت، پیچیدہ شاعری سکیموں اور گہری علامت نگاری کی خصوصیت رکھتی ہے، انھوں نے کمال مہارت سے اُردو اور فارسی الفاظ کو ایک ساتھ باندھا ہے ایک منفرد شاعرانہ زبان تخلیق کی جو خوبصورت بھی ہے اور جذباتی بھی، دلشاد نظمی کا استعارہ اور امیجری کا استعمال ان کی شاعری میں گہرائی اور پیچیدگی کا اضافہ کرتا ہے، جو قارئین کو ان کی شاعری کے اندر چھپے گہرے معانی پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے،

کسی پروہت پہ دیوداسی نثار ہو جائے تو عجب کیا
گھٹی گھٹی جسم کی خموشی پکار ہو جانا چاہتی ہے

.....

دلشاد نظمی کی غزلوں کی ایک خاص خصوصیت ان کے اشعار کی ساخت ہے، ہر شعر اپنے آپ میں ایک مکمل فکر ہے، پھر بھی باقی غزل کے ساتھ ایک مربوط شعری ڈھانچہ بناتا ہے۔ غزل کی شکل پر دلشاد نظمی کی مہارت انہیں ایک مقررہ شاعرانہ ڈھانچے کی پابندیوں کے اندر متنوع موضوعات اور جذبات کو تلاش کرنے کی اجازت دیتی ہے:

ہم نے سحری کی تھی باقر خانی سے
ہمسائے نے روزہ کھولا پانی سے

آ ورنہ برف بدن ہو جاؤ گے
چادر پھٹ جائے گی کھینچا تانی سے

.....

مزید برآں، دلشاد نظمی کی شاعری اس کے ابہام اور کثیر الجہتی معانی سے نمایاں ہے، ان کے اشعار اکثر تشریح کے لیے کھلے ہوتے ہیں، جو قارئین کو متعدد سطحوں پر متاثر کرتے ہیں، دلشاد نظمی کا موضوعاتی تضاد، حالات کی ستم ظریفی کا بیان اور لفظوں کا استعمال ان کی شاعری میں گہرائی اور پیچیدگی کا اضافہ کرتا ہے، جو قارئین کو ان کی شاعری کی پیچیدگیوں سے پردہ اٹھانے کا چیلنج دیتا ہے، دلشاد نظمی شاعری محبت، وجودیت اور روحانیت جیسے موضوعات کی اپنی کھوج کے ذریعہ انسانی تجربے کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں زندگی کی پیچیدگیوں اور انسانی حالت کے بارے میں گہری بصیرت پیش کرتے ہیں، اپنی لسانی چمک دمک اسلوبیاتی جدت اور گہری فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ دلشاد نظمی نے اُردو قارئین کو متاثر اور مسحور کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے، دلشاد ایک ایسا شاعر ہے جس نے نہ صرف اپنی ذات کی قید سے آزاد ہونے کی سنجیدہ کوشش کی بلکہ افقی طور پر پھیلنے کے بجائے چیلنگنگ عمودی فاصلے کا انتخاب کیا ہے، یہ ایک مشکل کام ہے اور زندگی اس کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ اس دوری میں منزل تک پہنچنے کے بجائے عمل خود ہی اہم ہو جاتا ہے، نظمی صرف جسم کی قید سے بچنا نہیں چاہتے اس کی مستقل تبدیلی کی خواہش

شدت سے ظاہر ہوتی ہے:

صرف دشمن کو تباہی کا سبب جانتے ہیں
آپ اپنوں میں منافق نہیں پہچانتے ہیں

مانتے ہی نہیں احکام خداوندی کو
اور کہتے ہیں کہ اللہ کو ہم مانتے ہیں

سمجھ رہے ہیں مکمل شعور آ گیا ہے
نئے پرندوں میں کتنا غرور آ گیا ہے

میرے قصے کے لیے کردار طے کرنے لگے
ایسے ویسے لوگ اب معیار طے کرنے لگے

جو ابھی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر ہیں کھڑے
وہ اپاہج اب مری رفتار طے کرنے لگے

.....

روح کو جسم کی قید سے آزاد کرنے کا عمل ایک طویل کوشش کا متقاضی ہے، یہ پھول سے خوشبو کی جدائی کے مترادف ہے لیکن جسم اور روح کے درمیان پیچیدہ بندھن اور جذبات انسانی نفسیات کے ساتھ عجب کھیل کھیل رہے ہیں، اور آزادی کا عمل اسے مزید پیچیدہ بناتا ہے، یہ ایک اُلجھے ہوئے دھاگے کی مانند ہے کہ الجھتے ہوئے اس فاصلے پر زیادہ تر مسافر اپنی منزل کا اعلان کرتے ہیں اور راستے میں ہی اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ انہیں منزل کا ادراک نہیں ہوتا، کوئی لمحہ بھی معمولی نہیں، شاعر اس معاملے میں کسی الجھن کا شکار نظر نہیں آتا، وہ منزل کی پیچیدگیوں سے واقف ہے اور سفر کے دوران اپنی عارضی تھکن کے آگے ہتھیار ڈالنے میں کوئی کراہت محسوس نہیں کرتا، وہ جانتا ہے کہ منزل مسلسل جد و جہد کے بعد حاصل ہوتی ہے اور راستے کے چھوٹے اُتار چڑھاؤ منزل کی سمت بتاتے ہیں،

نظمی کی شاعری کا ایک سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں انسانی وجود کی عارضی نوعیت کو گرفت میں لینے کی صلاحیت موجود ہ ''کوئی ایک لمحہ رقم نہیں'' وقت کی غیر معمولی نوعیت سے بات کرتا ہے، قارئین کو ہر لمحے کی قدر کرنے اور عدم استحکام کے حسن کو گلے لگانے کی تاکید کرتا ہے، نظمی اپنی غزلوں کی ذریعہ وہ میں زندگی کی نزاکت، مقصد اور جذبے کے ساتھ جینے کی اہمیت کی یاد دلاتا ہے،

رستہ بھی دیکھتا ہے مرے پاؤں کی طرف
لے جانا چاہتی ہے تھکن چھاؤں کی طرف

اس شہرِ بے پناہ کی گلیوں میں کھو گئی
جاتی تھی ایک پتلی سڑک گاؤں کی طرف

وقت کی تھاپ، تقاضوں کی تھرک، لے غم کی
جسم سے سانس کا رشتہ بھی ہے گھنگھرو جیسا

بہت کچھ سیکھتا آدمی باہر کی دنیا سے
مگر کچھ عادتیں دلشاد نظمی گھر سے آتی ہیں

اپنے دشمن کو دعا دیجیے کہ وہ زندہ رہے
عمر بھر آپ کے اخلاق سے شرمندہ رہے

''کوئی ایک لمحہ رقم نہیں'' میں اپنی ذات سے دُور رہنے کی خواہش کی تکمیل میں شاعر کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ یہ کہ حقیقت سے فرار کا عنصر کسی طور پر موجود دکھائی نہیں دیتا، ایک صوفی کی بے سکونی نہیں بلکہ جنون کا احساس ہے، اس نے اپنی فکری معیار کی بنیاد پر اپنی منزل کی تعریف متعین کی ہے، سماجی مسائل اور اس سے منسلک مشکلات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے اس سفر کا انتخاب کیا ہے، اسے اپنے قد کا اندازہ بھی ہے اور عزتِ نفس کا بھی اس معاشرے میں عمودی فاصلے پر فرار ہونا کسی کی عزت بچانے کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں:

دھکیل دیتا ہے بھیڑ کی اس پناہ سے کوئی ہاتھ باہر
مری اکائی جب ان گنت، بے شمار ہو جانا چاہتی ہے

سوال ننھا فرشتہ کرتا ہے جب کبھی تو تلی زباں سے
پڑھی لکھی شخصیت اچانک گنوار ہو جانا چاہتی ہے

.....

ہمارا شاعر جس معاشرے میں سانس لیتا ہے اس میں وہ عدم مساوات کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن ردِ عمل کے طور پر روتا نہیں بلکہ احتجاج ہوتا ہے، یہ شور کا معیار نہیں ہے بلکہ صرف ایک حل شدہ اعتراض ہے، اس احتجاج کے لئے اس نے کچھ مخصوص علامتوں کا انتخاب کیا ہے، صحرا، برف اور پتھر، اس کی پسندیدہ علامتیں ہیں، پتھر کی علامت، سماجی بے حسی، جذبات کی موت اور ذاتی بے بسی کا شدت سے اظہار کرتی ہے:

مجھے معلوم ہے اس دیوتا کی عظمتیں ساری
وہ پتھر تھا، کسی دستِ ہنر تک آ گیا ہوگا

.....

ایک اچھا فنکار اپنے فن کا نقاد بھی ہوتا ہے اور اس کے اپنے فن پر تنقیدی رویہ بھی اس کے فن کے حقیقی معیار کا تعین کرتا ہے لیکن یہ خوبی ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ایں مزید برآں نظمی کی شاعری روحانیت اور وجودی تحقیقات کے گہرے احساس سے لبریز ہے، ان کے اشعار اکثر کائنات کے اسرار پر کچھ اس انداز میں غور کرتے ہیں کہ وجود کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے چاہے محبت کی گہرائیوں کو تلاش کرنا ہو یا عقیدے کی پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونا، نظمی کی غزلیں انسانی حالت اور افراتفری کی دنیا میں معنی کی تلاش کے بارے میں گہری بصیرت پیش کرتی ہیں، ''کوئی ایک لمحہ رقم نہیں'' ایک دلکش شعری مجموعہ ہے جو اُردو غزل کے لازوال حسن کو ظاہر کرتا ہے، پروفیسر سید اشہد کریم اور ڈاکٹر قاسم خورشید کی طرف سے فراہم کردہ بصیرت افروز تبصروں کے ساتھ مل کر دلشاد نظمی کی ہنر میں مہارت، اس مجموعے کو شاعری کے شائقین اور اہلِ علم کو یکساں طور پر پڑھنا چاہیے، اپنے پُر جوش اشعار کے ذریعہ نظمی قارئین کو خود کی دریافت اور روشن خیالی کے ایک ماورائی سفر پر مدعو کرتے ہیں اور ان کے کام کا سامنا کرنے والے تمام لوگوں کے دل و دماغ پر اَن مٹ نقوش چھوڑتے ہیں

☆☆☆☆☆

سامنے مات ہے..... ثمینہ سیّد

پھر کہیں جا کے بنی شکل میرے ہونے کی
پہلے خوشبو میں میرا خواب ملایا گیا ہے

.....

یہ ہیں ثمینہ سید، ادب کی ہر صنف میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتی ہوئی اپنی بیریا، پُرخلوص محبت سے دلوں کو تسخیر کرتی آگے سے آگے بڑھتے چلے جانے والی ثمینہ کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں۔

یہی کوئی چار سال پہلے کی بات ہے ثمینہ سے ایک دو پروگرامز میں ملاقات ہوئی تو اس کی مسکراتی بولتی آنکھیں، لہجے کی اپنائیت اور مٹھاس نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے محسوس کیا یہ خاتون کہیں بھی ہوں اپنے بیساختہ چٹکلوں، شیریں بیانی اور سب سے بڑھ کر بے حد اپنائیت بھرے انداز سے اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتی ہیں۔ ہر ایک کے لیے اس کے لفظوں، لہجے اور گفتگو میں صرف پیار ہی پیار ہے۔

پھر ان سے ملاقاتیں ذرا تسلسل سے ہونے لگیں اتفاقاً ایسا ہوا کہ مختلف مواقع پہ ہم دونوں اکٹھے ہو گئے تو مجھ پر اس کا ایک اور جوہر کھلا کہ

ثمینہ سید نہ جلوت میں نہ خلوت میں کبھی بھی کسی کے بارے میں منفی بات نہیں کرتیں، اس بات نے میرے دل میں اس کے لیے محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت کا جذبہ بھی پروان چڑھایا۔

ثمینہ کی شاعری مجھ تک ثمینہ سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی اس کی شخصیت سے پہلے ہی میں اس کی غزلوں کی گرویدہ ہو چکی تھی۔

ثمینہ پانچ کتابوں کی مصنفہ ہے جس میں تین، ناول، ناولٹ، کہانیوں، افسانوں پہ مشتمل اور دو شعری مجموعے ہیں۔

اور گزشتہ چند برسوں سے ثمینہ نے تنقیدی مضامین اور کتابوں پہ تبصروں کا جو سلسلہ شروع کیا تو یہاں بھی اس کی صلاحیتوں

رقیہ اکبر

کے جوہر ہم سب پہ خوب خوب کھلے۔ جلد ہی اس نے ایک ماہر تبصرہ و تنقید نگار کی حیثیت سے بھی اپنی مضبوط پہچان بنالی۔

اس وقت میرے سامنے اس کی چھٹی تصنیف ''سامنے مات ہے'' موجود ہے جس کے بارے میں ثمینہ خود لکھتی ہیں

''سامنے مات ہے'' زندگی کے تاریک اور سسکتے لمحے، محبت، مروت اور بھرم بنائے رکھنے والے خالی لہجے جن کے اندر دل خراش چیخ ہے---

لیکن عورت مجسم محبت، وفا اور قربانی ہے۔ یہ دعویٰ نہیں ہے عمر بھر کا نچوڑ ہے۔

لفظوں کے آب و تاب میرے لہو کی گردش اور مجھ میں آتی جاتی سانسوں کو بحال رکھتی ہے۔

میں نظم کہنے کے بعد شعر کی تخلیق کے ساتھ کہانی رقم کر کے ہی ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا سکتی ہوں''

مجھے اک نظم کہنی ہے
مگر یہ نظم
کہنے سے ذرا پہلے
میں اپنے دل کا دامن تھام لوں گی
مجھے معلوم ہے کہ میرے لفظوں میں
اداسی بین کرتی ہے
مجھے اک نظم کہنی ہے
ایک ایسی نظم جس سے
زندگی کو دائمی اثبات ملتا ہے
تمہیں تو سب پتہ ہے ناں
مری نظمیں مری غزلیں
حیات بیاباں میں سانس لینے کا بہانہ ہیں
یہی بس وہ حرارت ہے
جو خوں بن کر رگوں میں سرسراتی ہے
تمہیں تو سب پتہ ہے ناں

.....

یہ کتاب مجھے تبھی مل گئی تھی جب شائع ہوئی اور پڑھ بھی لی تھی لیکن ثمینہ کا ایک کامیاب اور ماہر تبصرہ نگار ہونا میرے لیے اس کی کتاب پہ تبصرہ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا رہا۔

ظاہر ہے جسے خود اس معاملے میں ملکہ حاصل ہو اس کے سامنے تبصرے کے نام پر ٹوٹے پھوٹے لفظوں کا انبار رکھنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات تھی۔

لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ ان وجوہات کی بنا پر اپنے قارئین کو ثمینہ کی کتابوں سے متعارف نہ کروانا قارئین اور ثمینہ دونوں کی ساتھ زیادتی ہے سو جیسا بھی ہے حاضر ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

.....

ثمینہ کی شاعری کے بارے میں عہد حاضر کے معروف قلمکار جناب خالد شریف لکھتے ہیں:

ثمینہ سید محبت کی شاعرہ ہے، وہ درد سہنا اور شعر میں سمونا جانتی ہے۔ اس نے کتابوں سے پڑھ کر شاعری شروع نہیں بلکہ رائیگانی کا دکھ جھیل کر اسے نظم کیا ہے۔

اداسی کی ایک لہر ہے جو اس کی نظموں اور غزلوں کے بین السطور رواں دواں ہے''

اور کچھ ایسا ہی اس کی نظموں کے بارے میں محترمہ نیلما ناہید درانی بھی کہتی ہیں:

''مجھے تمہاری نظمیں زیادہ پسند ہیں کیونکہ ان نظموں میں مجھے اصلی ثمینہ سید دکھائی دیتی ہے۔ جس نے کہانی کے کرداروں یا غزلوں کے قافیہ ردیف کی بندش میں اپنے جذبات کو چھپانے کا ہنر نہیں سیکھا۔ جو بات کہنے اور بات میں تاثیر بھرنے کے ہنر سے آگاہ ہے''

ایک نظم کے چند اشعار سنیں:

وہ جو گمان کا ریشم تھا
اب الجھا ہوا ہے
تن پہ بھرم کی پھٹی پرانی چادر کو
سر تک کھینچوں
تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں

ثمینہ کہتی ہیں:

سنہری مشقتیں محض آزار ثابت ہوں تو مات کا جان لیوا احساس جسم و جاں میں ناسور بن کر پھیلنے پھولنے لگتا ہے۔ پھر ہمارے اطراف ہماری کامیابیوں کا مرانیوں کے انبار ہی کیوں نہ لگے ہوں اس بات کے احساس کو زائل نہیں کر پاتے''، لکھتی ہیں۔

ہماری اک کہانی کھو گئی ہے
تھی جس میں زندگانی کھو گئی ہے

میں واپس عمر کی دلدل میں اتروں؟
وہیں میری جوانی کھو گئی ہے

.....

عمر کے لیے دلدل کو بطور استعارہ کا کیسا خوب استعمال کیا ہے:

آگے دیکھئے محبت جیسے آفاقی جذبے پہ اجارہ داری کی خواہش لاحاصل کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

ہر اک دل پہ اترنے نا دوں میں یہ خوشبو
کبھی ملے جو محبت پہ اختیار مجھے

.....

محبت جیسا مضبوط جذبہ جو ہر پل ہر لمحے بے یقینی کی گرد میں لپٹا رہتا ہے۔ ازل سے چاہنے والوں کو محبوب کے بدل جانے، چھوڑ جانے کا خوف گھیرے رکھتا ہے جس کی وجہ سے عاشق لمحہ موجود سے لطف اندوز ہونے کے بجائے مستقبل میں جدائی کے خدشات میں ہی گھرے رہتے ہیں اس بے یقینی کا ثمینہ نے کچھ یوں اظہار کیا ہے:

کیا جانیئے کب دھوپ کی آغوش میں دے دے

جس شخص کا سایہ مجھے بادل کی طرح ہے
ایک اور جگہ لکھتی ہیں:
اس لئے بھی پڑے ہیں رستے میں
ہم اسے مل گئے تھے سستے میں

میری آنکھوں میں اب بھی ساون ہے
اس نے چھوڑا تھا مینہ برستے میں

.....

ثمینہ کی شاعری میں ہجر کے قصے وصال سے اور غم کی داستانوں کا بیان خوشی کن لمحوں کی مسرت وانبساطی سے کہیں زیادہ ہے۔
یوں لگتا ہے زندگی جیسے اس کے لیے
ہم پہ بیتی ہے بہت ہم نے گزاری کم ہے
کے مصداق رہی ہو۔
اور وہ خود اس کا اظہار کتاب کے دیباچے میں بھی کر گئی ہیں تبھی دکھ، غم، درد، نا آسودگی، رنج، الم اس کی شاعری میں بھی جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں لیکن اس سب کے باوجود حقیقی زندگی میں وہ اپنے غموں اور مشکلات کا کسی کو احساس بھی نہیں ہونے دیتیں۔ ہر لمحے چہچہاتی، کھلکھلاتی، مسائل و مشکلات کو چٹکیوں میں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ بڑے سے بڑی تکلیف میں بھی میں نے ثمینہ کے چہرے پہ نہ کبھی رنجیدگی کی کوئی جھلک دیکھی نا کبھی لبوں پہ حرف شکایت۔
نا خدا سے نا بندگانِ خدا سے--
ثمینہ سچ مچ ایک بہادر خاتون ہے
جو کمال ہمت اور بہادری سے اپنی راہ میں آنے والے سبھی کانٹے پلکوں سے چنتی چلی جا رہی ہے مگر نہ لبوں پہ شکوہ نا ماتھے پہ کوئی شکن۔
آخر میں اس نظم سے چند اشعار جس پہ اس کتاب کا عنوان ٹکا ہے۔

سامنے مات ہے
ریت سا مٹھیوں سے پھسلتا ہوا وقت ہے
کالے کپڑوں میں سہمی ہوئی راہگزر
سونی آنکھوں میں حلقے بناتی ہوئی گھات ہے
سامنے مات ہے
آئینے پہ جمی سالہا سال کی
گرد ہے
آنسوؤں کے سمندر میں بھیگی ہوئی
رات ہے
سامنے مات ہے

.....

دعا گو ہوں یہ نظم بس نظم ہی رہے ثمینہ سمیت کبھی کسی کے لیے بھی حقیقت کا روپ بن کر نہ ابھرے! آمین۔
تم جیو پیاری اور بہادر سہیلی ہزاروں سال اور ادبی افق پر ہمیشہ یونہی جگمگاتی رہو ڈھیروں کامیابیاں سمیٹو۔ آمین

☆☆☆☆☆

نسیم سحر کی ''اے ارض وطن'' اور ''شذرات نسیم سحر''

بیاض پڑھتے اور اس میں لکھتے ہوئے 6 سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔ نسیم سحر کا نام بھی پہلی بار بیاض کے ذریعے ہی سامنے آیا تھا۔ ان کی غزلیں اور مضامین خصوصاً نعتیہ کلام بیاض میں پڑھنے کو ملتا رہتا تھا۔ پھر کئی دوسرے ادبی جرائد میں ان کے طویل خطوط بھی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ دو سال پہلے انھیں اپنی کتاب بھیجی تو باقاعدہ ان سے رابطہ ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کی 24 سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ گزشتہ ماہ انھیں اپنی چوتھی کتاب بھیجی تو ان کی طرف سے کچھ کتابیں موصول ہوئیں۔ جن میں سے دو کتابیں اے ارض وطن، جوان کی قومی وملی شاعری پر مشتمل ہے اور شذرات نسیم سحر (مضامین اور دیباچے) اس وقت میرے سامنے پڑی ہیں۔

''اے ارض وطن''، نسیم سحر کی وطن کی محبت میں گندھی شاعری ہے۔ بقول محمد حمید شاہد کے ''اس مجموعے میں آپ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگی جو اپنی زمین، فکر اقبال اور ملت اسلامیہ سے جڑا ہوا ہے''۔ کتاب کا انتساب انہوں نے قائداعظم، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور پاکستان کے تمام جمہوریت پسندوں کے نام کیا ہے۔ نسیم سحر کی لکھی ان نظموں میں وطن کی محبت میں گندھے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ ان نظموں کے خیالات میں جذبات کی ترسیل نظر آتی ہے۔ چنانچہ اپنے پیش نامے میں لکھتے ہیں۔ ''پاکستان کے حوالے سے شاید کچھ نظموں میں شاید قاری کو کچھ جذباتیت بھی محسوس ہو۔ مگر کیا کیا جائے کہ مذہبیت کی طرح وطنیت اور قومی جذباتیت بھی میرے لہو کا حصہ ہے اور

رانا محمد شاہد

میں اسے چھپانے کے بجائے اعلانیہ طور پر ظاہر کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا''۔ معروف افسانہ نگار محمد حمید شاہد کی طرح ہمیں بھی ان کی درج ذیل مختصر نظم (ہائیکو) بہت پسند آئی۔

اکثر رہتے ہیں
عالی شان عمارت میں
چھوٹے چھوٹے لوگ

نسیم سحر کی زندگی کا بیشتر وقت سعودی عرب میں گزرا 1980 سے 2011 یعنی 31 سال تک انھوں نے سعودی عرب میں اسلامی ترقیاتی بینک جدہ میں چیف انگلش رپورٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس کتاب میں شامل زیادہ تر نظمیں سعودی عرب میں قیام کے دوران ہی لکھی گئیں ہیں۔ کتاب میں قومی وملی شاعری کے علاوہ مختلف سیاسی جماعتوں اور سماجی موضوعات پر بھی شاعری جگہ جگہ بکھری نظر آتی ہے اسی طرح مخصوص قومی ایام جیسے یوم یکجہتی کشمیر، یوم پاکستان، یوم آزادی، یوم سقوط ڈھاکہ، یوم دفاع وغیرہ پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب کے صفحہ 124 پر ''سچے پاکستانی کا عزم'' کے عنوان سے انھوں نے ایک نظم لکھی۔ اس میں ایک بڑی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہوں گا۔ نظم کے اوپر درج ہے کہ 5 جولائی 2008 کو جنرل ضیاالحق نے پیپلز پارٹی کی حکومت توڑ دی تھی۔ یہاں 5 جولائی 1977 آنا چاہیے تھا۔ یہ یقیناً کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

''اے ارض وطن'' قومی وملی شاعری کے ساتھ ساتھ سماجی و استحصالی رویوں، انسانیت، جمہوریت اور امن ومحبت کا پرچار کرتی نظر آتی ہے اور بقول رونق حیات کہ'' مصنف نے ''اے ارض وطن'' کی شکل میں قومی وملی شاعری کا ایک خوبصورت جہان پاکستانی ادب کے ذخیرے میں شامل کر دیا ہے''۔

کتاب میں سے کچھ اشعار:

باغی سپاہی

تم نے دیا ہے حکم کہ ہتھیار پھینک دوں
ہاتھوں سے جوش وعزم کی تلوار پھینک دوں

میداں میں سرخ سرخ لہو تو بہے گا آج
یا میں رہوں گا یا مرا دشمن رہے گا آج

یوم اقبال

یاد تو ہر سال ہم اس کی مناتے جائیں گے
اور یوں تھوڑی بہت شہرت بھی پاتے جائیں گے
ہم پیام شاعر مشرق بھلاتے جائیں گے
گر بچارے کو یونہی قوال گاتے جائیں گے

ایک سوال

پاکستان، جو ہم سب کی امیدوں کا سرمایا ہے
جس میں رہ کر ہم نے جو کچھ چاہا ہے، وہ پایا ہے
ہم سے پوچھ رہا ہے، ہم نے اس کو کیا لوٹایا ہے؟

یوم قائداعظم

ہمیں ادراک ہی اب تک نہیں ہے اس حقیقت کا
''خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا''
سو ہم نے آج تک اپنی کوئی عادت نہیں بدلی

بنام وطن

امید موسم گل تو کبھی مرتی نہیں ہرگز
خزاں کی رت میں بھی اپنا چمن اچھا تو لگتا ہے

یہاں پر لاکھ ناانصافیاں ہوں اور ظلمت ہو
وطن سے پیار ہوتا ہے، وطن اچھا تو لگتا ہے

.....

کتاب کے آخر میں 6 صفحات پر مشتمل ان کی مختصر سوانح بھی نظر سے گزری 1962 سے جاری نظم ونثر کا یہ سلسلہ جاری ہے اور اب تک ان کی مختلف موضوعات پر 24 کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ایک درجن کے قریب زیر ترتیب ہیں -ان کی یہ تصانیف بتاتی ہیں کہ وہ صاحب مطالعہ و صاحب مشاہدہ شخص ہیں- نسیم سحر کئی ادبی و سماجی تنظیموں کا بھی حصہ رہے- وہ سعودی عرب میں ادبی سرگرمیوں کی رپورٹنگ ایک طویل عرصہ تک پاکستانی اخبارات و جرائد میں لکھتے رہے -ان میں اخبار جہاں، نوائے وقت اور رابطہ نمایاں ہیں- نوائے وقت اور نئی بات میں کالم بھی لکھتے رہے- ویسے نئی بات کے ادبی صفحے پر ان کے مضامین والے کئی اخبار تو میرے پاس بھی محفوظ ہیں- میرے لیے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث تھی کہ نسیم سحر کی ادبی خدمات پر متعدد یونیورسٹیز کی طرف سے ایم فل کے مقالہ جات لکھے گئے اور کئی ادبی جرائد نے ان پر خصوصی گوشے شائع کیے- حال ہی میں انہیں ایک معروف ادبی جریدے کی طرف سے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا-

''شذرات نسیم سحر'' ان کے مضامین اور دیباچوں کی کتاب ہے-اس کتاب کی ابتدا میں انھوں نے ضروری نوٹ کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب کے بیشتر مضامین ان کی ایک اور تنقیدی مضامین کی کتاب ''رشحات نسیم سحر'' میں شائع ہو چکے ہیں -وہ کتاب جلد ختم ہوگئی- چنانچہ دوسرے ایڈیشن کی ضرورت پڑی تو اس دوران مصنف نے مزید مضامین تحریر کر لیے تھے - چنانچہ ''شذرات نسیم سحر'' میں کچھ مضامین کا اضافہ کیا گیا جبکہ کچھ تحریریں حذف کی گئیں-اس کتاب میں نسیم سحر کے 27 مضامین، جو مختلف کتابوں پر تاثرات پر مبنی ہیں جبکہ 6 دیباچے شامل ہیں-

کتاب کے انتساب میں سسپنس موجود ہے - لکھتے ہیں -''میرے حق میں دعا کے لیے اٹھنے والے چار مہربان ہاتھوں کے نام'' آگے ان شخصیات کا بتایا نہیں گیا-اس کتاب میں شاعری اور نثر کی مختلف اصناف پر مبنی کتابوں پر مضامین تحریر کئے گئے ہیں- کتابوں کے مصنفین میں معروف لکھنے والے بھی شامل

میں اور باغ

منظر اعجاز کے شعری مجموعہ ''میں اور باغ'' کے مطالعہ کے بعد میں اس احساس سے دوچار ہوئی کہ زندگی سرشاری و شادکامی سے لبریز کسی گلستاں کی مانند ہے۔ مطالعہ کے دوران میں نے اس کے ہر صفحے میں بسے ہوئے باغ کے ہر پھول کی خوشبو کو مشامِ جاں میں اترتا محسوس کیا۔ منظر اعجاز کی نظموں کا اسلوب انتہائی دل کش ہے اور اسی اسلوب کے سہارے وہ تلخ سے تلخ بات کو بھی عجب والہانہ پن سے بیان کر دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بولتے ہوئے لفظ ان کے اظہار کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔

میرے خیال میں اچھی نظم جس چابکدستی سے اپنے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہیں موضوع کی جزئیات واضح کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ حسنِ سخن ہر سخنور کے بس میں نہیں ہوتا۔ منظر اعجاز اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ بات کو بے جا طویل بھی نہیں ہونے دیتے اور اختصار کے چکر میں منظر کے اجزا کو پسِ پشت بھی نہیں ڈالتے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی نظم اختصار وطوالت کے بین بین قاری کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ ان کے ہاں ہر موضوع کا احاطہ کرتی نظمیں موجود ہیں۔ بات رومانی طرزِ فکر کی ہو کہ سماجی تلخیوں کی وہ توازن برقرار رکھتے ہیں۔ لفظوں سے پینٹ کرنا گویا ان کے تخیل اور وجدان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک نظم ''حیرت رقصاں رہتی

حنا بابر

ہے'' سے چند مصرعے دیکھیے:

میں پانی پر چلتے چلتے
کتنی دور نکل جاتا ہوں

ندی، دریا، جھیل، سمندر
مجھ کو چھوٹے پڑ جاتے ہیں

اسی نظم میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

روز ہوا کے ہاتھ میں
تیرے نام کے پندرہ خط دیتا ہوں

ایک مختصر نظم ''بے باکی دیکھیے'':

جب تم شرما جاتی ہو
مجھ کو اپنی بے باکی پر
ڈھیروں پیار آ جاتا ہے

تین مصرعوں میں بظاہر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ اختصار میں اس قدر جامعیت اُنھی کا حصہ ہے۔

نظم ''گم'' میں منظر اعجاز کا منفرد پیرایۂ بیان دیکھیے:

نظم گم
بادگیر خیالات رنگین میں نظم گم
اور بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی:

بادِ سب رنگ
لفظوں کے کنکوے
جانے کہاں سے اڑا لاتی ہے.....
حرف آراستہ شہ نشینوں سے قصے اٹھا لاتی ہے.....

برف زاروں، ستاروں، پہاڑوں کی
ہیبت میں ہے چشم گم
اور ہیبت سے اٹھکیلیوں میں مگن گم
چشمہ نظم گم

عہدِ حاضر میں نظم گو شعرا کے ہاں جو عجلت در آئی ہے، اس نے ادراک و احساس کے دروازے ان پر بند کر دیے ہیں۔ لیکن منظر اعجاز کو گویا کوئی جلدی نہیں یا پھر جذبات و احساسات کی پختگی نے انھیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں کوئی چیز ان سے مخفی نہیں رہ پاتی۔ ان کا چیزوں کو دیکھنے کا اپنا انداز ہے اور اسی انداز نے انھیں اپنے عہد کے نظم گو شعرا سے منفرد اور ممتاز کر دیا ہے۔

موجودہ دور کے سامراج اور حاکمِ وقت کے بنائے ہوئے خود ساختہ نظام میں انھیں کسی گزرے ہوئے دور کا تخیلاتی عکس نظر آتا ہے۔ ان کا تخیل انھیں ان کے حال سے ماضی کی طرف لے جاتا ہے جہاں ایک عام انسان کا استحصال آج ہی کی مانند تھا، فرق ہے تو صرف اتنا کہ اب ذرا طور طریقے بدل گئے ہیں۔ نظم 'ایک عام پتھر کی کہانی' سے چند مصرعے دیکھیے اور داد دیجیے کہ اپنی بات کہنے کا اس سے خوبصورت انداز، کم سے کم میں نے نہیں دیکھا:

آج کچھ دیر کو پانی ذرا اترا ہے

ہیں۔ ان میں سعود عثمانی کی کتاب ''جل پری''، ''اہل قلم کے مکاتیب بنام غازی علم دین''، گلزار بخاری کی کتاب ''ہوا پتے گرانے لگی''، شہزاد نیر کی نظموں کی کتاب ''گرہ آسانی سے نہیں کھلتی''، ریحانہ قمر کی ''حیرت سرائے عشق کی پاگل چڑیا''، ڈاکٹر بدر منیر کی ''خندہ بازار''، خالد معین کی ''ناگہاں''، افضل عارش کی ''ان دیکھا در اک اور باقی ہے''، خالق آرزو کا شعری مجموعہ ''پلکیں بھیگنے لگتی ہیں''، کامران احمد کا ناول ''لوگ کیا کہیں گے''، حسنین نازش کا سفر نامہ ترکی اور دیگر مصنفین کی کتابوں پر نسیم سحر نے بطور محقق اور نقاد رائے دی ہے اور تنقیدی شعور کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ جبکہ قمر الطاف، ماجد جہانگیر، سید قمر حیدر قمر، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، رفعت وحید کی کتابوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ یہ تمام دیباچے شاعری کی کتابوں پر تحریر کیے گئے ہیں۔

کتابوں پر تحریر کردہ مضامین میں ہمارے شہر بورے والا کے ایک سینئر لکھنے والے اکرم باجوہ صاحب کی کتاب ''ایک تکبیری للکار'' پر بھی تبصرہ شامل ہے، جن کا گزشتہ سال انتقال ہوگیا تھا۔ پروفیسر اکرم بوجوہ سے ہماری بھی دو، تین ملاقاتیں رہیں۔ آخری سالوں میں وہ ایک پرائیویٹ کالج سے منسلک رہے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنی کتاب ''قریہ تحقیق'' کالج میں ملاقات کے دوران دی تھی۔ ایک روز ڈاک خانے میں اچانک ملاقات کے دوران میں نے کہا کہ آپ کی کتاب پر تبصرہ لکھ لیا تھا مگر کالج حاضر نہ ہو سکا۔ چنانچہ انھوں نے دو دن بعد بیٹے کو بھیج کر کتاب پر تبصرہ منگوا لیا تھا۔ یہ سب باتیں نسیم سحر کے مضمون ''ایک تکبیری للکار'' پڑھتے ہوئے یاد آگئیں۔ ویسے یہ تحریر پڑھتے ہوئے مجھے نسیم صاحب کی کتاب ''اے ارض وطن'' بھی یاد آتی رہی کہ دونوں میں کافی مماثلت تھی۔ دونوں میں زیادہ شاعری وطن کی محبت کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس تبصرے میں مجھے اکرم باجوہ کی ''مٹی'' پہ لکھی نظم کے یہ شعر بہت پسند آئے:

مری سانسیں مہکتی ہیں اسی مٹی کی خوشبو سے
مجھے ہے عشق مٹی سے، مرا وجدان مٹی سے

لہو سے سینچ کر اس کو، مجھے شاداب کرنا ہے
ازل سے میں نے باندھا ہے یہی پیمان مٹی سے

مری مٹی کی نسبت کربلا، مکہ، مدینہ سے
کہ ہر لمحہ مہکتا ہے مرا ایمان مٹی سے

---

190 صفحات پر مشتمل ''شذرات نسیم سحر'' ادبی موضوعات کے شائق افراد کے لیے بہت سی دلچسپیوں کا سامان لیے ہوئے ہے۔ کتاب بہترین کاغذ اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

تو اس ٹیلے پہ
اک قلعے کی بوسیدہ عمارت کے نشاں دیکھتا ہوں
(قلعے بنتے ہیں تو کمزور کے گھر ٹوٹتے ہیں)
دوارب سال
تہہِ آب بھی
اس ٹیلے کی ڈھلوان پہ گھر میرا تھا
ہانپتی کانپتی
اور درد سے چلاتی مشینیں
مجھے بتلاتی ہیں
حاکم وقت
یا خود ساختہ معبود کے مسکن کے لیے
اک نئے قلعے کی تعمیر کی تیاری ہے
اور مجھ جیسے بہت سوں کے لیے حکم نیا جاری ہے

یہاں شاعر کے اندر کا انسان گویا ہوتا ہے:
اپنی ڈھلوان پہ اس قلعے کا قبضہ نہیں دیکھا جاتا
آج بھی اور کل بھی اہلِ اقتدار کس طرح عام انسانوں کے جذبات کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے بھڑکاتے تھے، اپنے کام میں لاتے تھے اور جونہی ان کا مقصد پورا ہو جاتا تھا، منظر سے ہٹا دیتے تھے۔ ''میں اور باغ'' میں ایسی نظمیں آپ کو وافر تعداد میں ملیں گی۔ بات صرف محسوس کرنے کی ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے اور ادراک و احساس کی کن گھاٹیوں سے ہو آیا ہے۔

''میں اور باغ'' میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی ہیں۔ منظر اعجاز نے اس باب میں بھی اپنی جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی الفاظ سازی نے وہ تخیلاتی دنیا آباد کر دی ہے جسے دیکھنے والا اس میں کھو جاتا ہے اور تادیر اس کے طلسم سے خود کو نکال نہیں پاتا۔ منظر اعجاز کی اس کتاب میں شعریت، رجائیت، درد، کسک، گئے دنوں کی یادیں قاری کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے ان کے چند اشعار پیش کرنا چاہوں گی جو ان کی انفرادیت کا ثبوت ہیں:

ہیں مگر ایسے اصولی بھی نہیں ہیں ہم لوگ
حکم دے، ہم ابھی معیار سے ہٹ جاتے ہیں

.....

پوچھنے آ گیا ہے میرا حال
یار حیران کر رہا ہے تو

.....

اس کا پرتو کبھی جھلکے تو مجھے دیکھ سکو
یوں تو شیشے کی طرح خالی نظر آتا ہوں

.....

ہم کو منظر جدا نہ کر ڈالیں
شہر کے راستوں سے ڈرتا ہوں

.....

ہمارا راہنما ذہن ہے کہ آنکھ، کہ کان
بلا سے دل ہو، کوئی فیصلہ اٹل ہو جائے

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

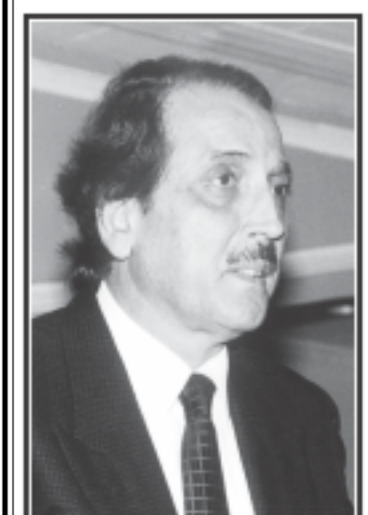

شوکت علی شاہ

ڈیرہ غازی خان پنجاب کا آخری ضلع ہے۔ کسی زمانے میں راجن پور اس کی تحصیل ہوا کرتی تھی۔ دریائے سندھ ڈی جی خان اور مظفر گڑھ کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس کے کچھ قصبے دریا کی دوسری طرف بھی ہیں لیکن وہ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ جب پل نہیں بنا تھا تو لوگ سٹیمر کے ذریعے دریا عبور کرتے تھے۔ وہ سٹیمر آج بھی پل کے نزدیک ناکارہ حالت میں کھڑا ہے۔ پاکستان کے دیگر پلوں کی طرح یہ پل بھی کچھ ٹھیک طرح نہیں بنا لیکن غنیمت ہے۔ ڈیرہ غازی خان کا شہر دریا سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر پھیل رہا ہے۔ آبادی کا رجحان اس طرف

ہے۔ کسی دن دریا کے دائیں کنارے پوری بستی آباد ہو جائے گی۔ ضلع میں زرعی زمین رقبے کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ بیشتر علاقہ پہاڑی ہے جہاں دریا کا پانی پہنچ سکتا ہے اور نہ ٹھیک طرح کاشت ہو سکتی ہے۔ ضلعے میں دو بڑے شہر ہیں۔ ڈی جی خان اور تونسہ شریف۔ تونسہ شریف کی سرحد ڈیرہ اسماعیل خان سے جا ملتی ہے۔ تعلیم کے اعتبار سے یہ واحد تحصیل ہے جہاں شرح خواندگی بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کا مشہور مزاح نگار، فکر تونسوی اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے سکول کے دنوں میں اسے پڑھا تھا۔ بڑا شستہ مزاح لکھتا تھا۔ اس کا مضمون ''ایک غیر شریفانہ پروگرام'' مجھے بڑا پسند آیا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ حسب حال تھا۔ ہر شریف آدمی زندگی میں کئی غیر شریفانہ پروگرام بناتا ہے جو کم ہمت اور تھڑ دلے ہیں ان کا پروگرام بس سوچ بچار تک ہی محدود رہتا ہے اسے عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ دھڑلے دار لوگ نہ صرف اس پر عمل کرتے ہیں بلکہ اکثر حد سے آگے بھی بڑھ جاتے ہیں اور معاشرے کی حدود و قیود کی پروا نہیں کرتے۔ پہلی کیٹگری والوں کو سرگشتہ خمار رسوم و قیود کہتے ہیں اور دوسری کو محاورے کی حد تک شتر بے مہار کہا جاتا ہے۔ اپنی خاندانی شرافت کا اکثر لوگ ذکر کرتے ہیں۔ فکر صاحب اس لن ترانی سے اپنے آپ کو دُور نہ رکھ سکے۔ لکھتے ہیں کہ ان کے دادا کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ پندرہ برس تک جس لڑکی سے محبت کرتے رہے اس سے اظہارِ اُلفت نہ کر سکے۔ وہ تو بھلا ہو ان کی دادی جان کا جنھوں نے دادا جان کو یاد دلایا کہ وہ ان سے غالباً محبت کرتے ہیں۔ وہ ایک لمحہ کارگر ثابت ہوا وگرنہ ہندوستان ایک بہت بڑے مزاح نگار سے محروم ہو جاتا۔

ڈیرہ غازی خان کا ''کوہ مری'' فورٹ منرو ہے۔ یہ سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہے لیکن مری کی طرح نہ تو سرسبز و شاداب ہے اور نہ آباد۔ اِکا دُکا مکانات ہیں۔ اب حکومت نے کچھ توجہ دینی شروع کی ہے۔ ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے جس کے کنارے پر پی ٹی ڈی سی کا ہوٹل ہے۔ محکمے کے دیگر ہوٹلوں کی طرح یہ بھی ویران و پریشان نظر آتا ہے، بہرحال غنیمت ہے۔ علاقے کی آبادی متمول نہیں ہے کہ مہنگے کمروں میں رہ سکے۔ سرکاری افسران ریسٹ ہاؤسوں میں ٹھہرتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ہاؤسز ہیں جنھیں اچھی طرح سے فرنشڈ کیا گیا ہے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر گرمیاں یہاں گزارتے تھے۔ ان کا سمر ہیڈ کوارٹر ڈیرہ سے فورٹ منرو شفٹ ہو جاتا تھا۔ سرد ملک کے رہنے والوں کے لیے تمازت آفتاب برداشت کرنا مشکل تھا۔ خوش قسمتی سے ہر جگہ انھیں پہاڑی مقامات

میسر ہوئے۔ وائسرائے ہند شملہ شفٹ ہو جاتا - ڈلہوزی، نینی تال، کشمیر، کوئٹہ، زیارت، مری، نتھیا گلی کے علاوہ بیسیوں دوسرے مقامات تھے۔ ڈپٹی کمشنر کیمپلپور، سرگودھا اور میانوالی سکیسر کی پہاڑی پر ڈیرے ڈال دیتے۔ دن کو کام اور شام کو صاحب اور میم صاحبہ نیکریں پہن کر پہاڑ پر چہل قدمی کرتے۔ واپسی پر خدام بیئر کی یخ بوتلیں میز پر سجا رکھتے۔ حقہ بھی تازہ دم ہوتا۔ صاحب کے کتوں کے لیے الگ سے بندوبست کیا جاتا۔ میموں کا بس چلتا تو انھیں بھی اپنے ساتھ کھانا کھلاتیں اور سلاتیں۔ لندن یا گلاسگو سے آئے ہوئے صاحب بہادر کو اپنے آپ کو اس ماحول میں ڈھالنا حیران کن بات تھی۔ ایمپائرز ویسے تو کھڑی نہیں ہو جاتیں ان کے لیے تدبیر، تدبر، فہم و فراست، حوصلہ اور بردباری شرط اوّلین تھیں۔ دیہاتی لوگ گورے رنگ کی میموں کو اسی طرح دیکھتے جس طرح مولوی تصور میں جنت کی حوروں کو دیکھتا ہے اور بار بار ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ہمارے علاقے میں تو باقاعدہ Folk songs گائے جاتے۔ ''اچا ہوائی بنگلہ وچ میماں ٹہل دی آں''۔

ڈی سی ہاؤس سے ملحق گورا قبرستان بھی ہے۔ وہاں کوئی انگریز ڈپٹی کمشنر تو دفن نہیں لیکن کچھ فوجی افسروں اور انجینئرز کی قبریں ہیں جو غالباً پہاڑ میں سڑک بناتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔ انگریز کے لئے وہ سڑک فوجی نکتہ نظر سے اہم تھی۔ یہ متبادل سڑک براستہ رکنی، کوئٹہ جاتی تھی۔

پہاڑ کی ڈھلان پر لغاریوں کے بنگلے ہیں۔ علاقہ میں بنیادی طور پر لغاری بلوچ آباد ہیں۔ فاروق حیدر لغاری سردار تھا۔ اس کے والد نے یہاں مکان بنوایا۔ اس کی دیکھا دیکھی دیگر سرداروں نے بھی موسم گرما کے لئے حسب ضرورت بنگلے بنوائے۔

ڈی جی خان سے فورٹ منرو جاتے ہوئے کوٹ سرور کا قصبہ آتا ہے جہاں پر سخی سرور کا مزار ہے۔ اس دُور دراز علاقے میں بھی مزار مرجع خلائق ہے۔ کافی لوگ آتے ہیں۔ سالانہ عرس پر تو باقاعدہ ایک اور قصبہ آباد ہو جاتا ہے۔ قوال، سرکس، تھیٹر، بازی گر اور رقاص اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ضلع میں کئی بلوچ قبیلے آباد ہیں۔ لغاری، کھوسہ، قیصرانی میرانی، مزاری، دریشک وغیرہ۔ چونکہ راجن پور الگ سے ضلع بن چکا ہے اس لیے مزاری اور دریشک وہاں پر سیاسی پنجہ آزمائی کرتے ہیں۔ نصراللہ دریشک اور بلخ شیر مزاری میں براہ راست مقابلہ ہوتا ہے۔ کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہوتا ہے تو کبھی دوسرا میدان مار لیتا ہے۔ دریشک چالاک اور ہوشیار ہے، سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔ اسے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ سیاست بغیر پیسے کے نہیں چل سکتی اس لیے حصول زر کے بھی سبھی طور طریقے

جانتا ہے۔ اس کی نسبت میر بلخ شیر مزاری سادہ بلوچ ہے۔ خاندانی طور پر تو اس کا قد کاٹھ دریشک سے بلند ہے لیکن وہ داؤ پیچ نہیں جانتا جس کا دریشک ماہر ہے اس لیے اکثر گھاٹے میں رہتا ہے۔ مزاری عبوری مدت میں وزیراعظم بھی رہا ہے لیکن وہ چند دن کی چاندنی تھی۔

سوئے حجاز چل: میں نے حج بیت اللہ کا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ یہ نہیں کہ خواہش نہ تھی۔ کسی بھی مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ اکثر لوگ سوچتے ہیں کہ ابھی کیا جلدی ہے چند برس اور سہی۔ ویسے بھی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ معاشی ناہمواریاں، معاشرتی ناصبوریاں، دنیا کے جھمیلے، زندگی کے موج میلے، یہ سوچ بھی قائم رہتی ہے اور کاروانِ حیات بھی غیر محسوس انداز میں آگے بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ اچانک ایک دن چار سو گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ وقت کا غلام در و جود پر دستک دیتا ہے اور سرپٹ دوڑتا ہوا رہوار زیست لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ اس وقت ان آخری لمحوں میں آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ بڑی دیر ہو گئی۔ اس طرح سب حسرتیں، خواہشیں، آرزوئیں اور ارادے بھی انسان کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔

مجھے کسی قسم کی بشارت بھی نہ ہوئی تھی نہ کسی مجذوب سے پالا پڑا تھا جس نے لٹھ مار کر حج کا راستہ آسان بنا دیا ہو، نہ کسی پیر فقیر نے اپنے روایتی مبہم اور ذو معنی الفاظ میں یہ مژدہ سنایا تھا اور نہ کبھی خواب میں نورانی چہرے، سبز لباس پہنے، کسی گھڑسوار بزرگ سے ملاقات ہوئی تھی جنھوں نے تھپڑہ مار کر فرمایا ہو ''اُٹھ اے غافل انسان! دیکھ تو سہی یہ روشن راستے کس منزل کی طرف جا رہے ہیں۔''

خواب بھی آتے تھے تو بڑے اُوٹ پٹانگ اور بے ہنگم قسم کے۔ کبھی چیف سیکرٹری صاحب ناراض ہو رہے ہیں کہ امن عامہ کی صورت بگڑتی جا رہی ہے تو کبھی گورنر صاحب کی جھڑکیاں سننی پڑتیں جو تعمیراتی منصوبوں کی بروقت تکمیل کے خواہاں تھے۔ شاید دنیادار اور گنہگار انسانوں کو اچھے خواب نہیں آتے۔ جب زہد و تقویٰ کے جاگنے کا وقت ہوتا ہے اس سے تو یہ سوتے ہیں۔

لیکن کیسا ہی گنہگار اور دنیادار انسان کیوں نہ ہو، ندامت کا عنصر وجود کے کسی کونے کھدرے میں ضرور چھپا رہتا ہے۔ میرے لیے یہ بات ہی سوہانِ روح تھی کہ بجز ندامت رب کعبہ اور رسالت مآبؐ کے حضور کیا لے کر جاؤں گا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود غرضی، منافقت، لالچ، تنگ نظری اور تعصب نے ہماری زندگیوں کو داغدار کر دیا ہے۔ محض نماز پنج گانہ نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ حقوق العباد بھی عبادت کے زمرے میں آتے ہیں اور دین مبین کا

یہی وہ اعلیٰ وارفع تصورِ حیات ہے جو اسے دیگر مذاہب سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ دیگر مذاہب میں عبادت بھی ہے لیکن اسلام میں عبادت ہی ہے۔ ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کے بندوں کی فلاح کے لیے کیا جائے، عین عبادت ہے۔

دراصل ہوا یوں کہ میں لاء اینڈ آرڈر کانفرنس کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا۔ بڑی اہم کانفرنس تھی۔ فرقہ وارانہ تشدد اور خون ریزی کے واقعات نے انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ امام بارگاہوں، مساجد اور دیگر مقامات پر لوگ مذہبی منافرت کا شکار ہو رہے تھے۔ جوان، بزرگ، عورتیں، بچے سب لقمہ اجل بن رہے تھے۔ انسان انسان کو بھون رہا تھا، آدمی آدمی کا شیطان بن گیا تھا۔ انسان اس قدر وحشی ہو سکتا ہے۔ گورنر صاحب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ایک قلزم خون تھا جسے عبور کر کے ہم آزادی کی منزل تک پہنچے۔ انگریز سے نجات اور ہندوؤں سے چھٹکارا حاصل کیا اب اور کتنے دریا ہمیں عبور کرنا ہوں گے؟

حیران کن بات یہ ہے کہ جس دین مبین کے ہم داعی ہیں، جس خدا اور رسول کو مانتے ہیں انھوں نے تو رواداری کا درس دیا۔ آنحضورؐ کی ساری زندگی تحمل، برداشت اور رواداری سے عبارت تھی۔ من حیث القوم ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ یومِ حساب ہم کیا جواب دیں گے؟ میں انھی سوچوں میں غلطاں تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ بہاول پور سے میرا پی اے بلال بول رہا تھا۔ ''حج کے لیے قرعہ اندازی ہو رہی ہے، کیا آپ کا نام بھی ڈال دیا جائے؟''

''ہاں'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

جب میں بہاول پور واپس پہنچا تو سب سے پہلی خبر جو مجھے سنائی گئی یہ تھی کہ میرا نام قرعہ اندازی میں نکلا ہے۔ خوشی کے ساتھ ساتھ فوراً ایک فکر بھی دامن گیر ہو گئی۔ لوگ کیا کہیں گے، کمشنر تھا اس لیے نام تو نکلنا ہی تھا۔ گھبراہٹ میں میں نے سارے سٹاف کو طلب کر لیا۔ اس مجسٹریٹ کو بھی بلوا لیا جس نے قرعہ اندازی کرائی تھی۔ سب نے بیک آواز کہا کہ قرعہ اندازی منصفانہ تھی اور آپ کو اُوپر سے بلاوا آیا ہے۔ اس پر بھی میری تسلی نہ ہوئی اور میں نے خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اپنے طور پر تحقیق کرے۔ تحقیق کے بعد اس نے رپورٹ دی کہ قرعہ اندازی ضابطہ کے مطابق اجلاس عام میں ہوئی ہے اور پہلی جماعت کے ایک بچے نے پرچی نکالی تو سب سے پہلے آپ کا نام نکلا۔ میری تسلی تو ہو گئی لیکن ایک بے نام سی خلش مجھے اب بھی بے چین کیے جا رہی تھی۔ جب فائل آخری منظوری کے لیے میرے پاس آئی تو میں نے اس پر نوٹ لکھا کہ میری جگہ کسی اہلکار کو بھیج دیا جائے میں اپنا بندوبست خود کر

لوں گا۔ اس پر آفس سپرنٹنڈنٹ نے جو جوابی نوٹ لکھا وہ خاصا سخت تھا۔ اس نے لکھا کہ قواعد وضوابط سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی جگہ کسی دیگر شخص کو بھیجا جا سکتا ہے اور نہ آپ کو یہ اختیار ہے کہ کسی کو نامزد کر سکیں۔ میں نے نوٹ پڑھ کر آسمان کی طرف دیکھا لبیک اللھم لبیک بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں سجدہ ریز ہو گیا۔

جانے سے پہلے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر دعوت میں، ہر ملاقات پر احباب، عزیز رشتہ داروں کا صرف ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ روضۂ رسول پر ان کے لیے دعا کی جائے۔ گڑگڑا کر، عجز و انکسار کے ساتھ، دست بستہ! یا مظہر العجائب! میں نے سوچا ''تو نے یہ کیسا انسان کامل بھیج دیا ہے جس نے قلوب کو منور کیا، اذہان کو جلا بخشی۔ فکر کو آزاد کیا۔ بتانِ رنگ دخوں کو پاش پاش کیا۔ زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا، مرنے کے آداب بتائے۔ آدمیت کو معراج بخشی۔ ثبوت حق بھی پیش کیا اور پیغام حق بھی ذہن نشیں کرایا۔ وہ جو کاروانِ انبیاء کا قافلہ سالار تھا۔ وہ جو افواج دیں کا شہسوار تھا، وہ جو علم و حکمت کا خزانہ تھا، وہ جو جرأت وشجاعت کا سکندر تھا۔ پیکر جود وسخا، مرکز صدق وصفا، کتاب اللہ کی زندہ تفسیر، آسمان رسالت کے بدر منیر۔ چودہ سو برس بیت گئے، چودہ ہزار برس بیت جائیں گے، چودہ لاکھ صدیاں گزر جائیں گی۔ اتباع رسولؐ میں کمی نہیں آئے گی۔ عجز وعقیدت کے چشمے کبھی خشک نہیں ہوں گے۔ کروڑوں، اربوں انسان اپنی صبح کا آغاز ذات باری تعالیٰ کے بعد اس کے نام سے کریں گے۔ اپنی شامیں اس کی یاد سے مشکبار کریں گے۔ ایک لاکھ احادیث امام بخاری کو زبانی یاد تھیں۔ جو انھوں نے کہا جو انھوں نے کیا جو دیکھا، جو محسوس کیا، جس پر خوش ہوئے، جس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ماکولات، مشروبات، معمولات زندگی، اگر دو دندان مبارک شہید ہوتے ہیں تو لوگ اپنے جبڑے توڑ دیتے ہیں، اگر خون کا ایک قطرہ گرتا ہے تو لاکھوں اشک پیازی ہو جاتے ہیں۔ موئے مبارک مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ پاپوش، تخت پوش چومتے ہیں۔ دریدہ کالی کملی جو عقیدت کا استعارہ بن گئی۔ مدینہ جو جذبوں کا نگینہ ہو گیا۔ آدم سے لے کر ایں دم ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے۔ شاہانِ پرغرور، سکندر و دارا آئے اور پیوند خاک ہو گئے۔

لاکھوں سالوں میں، اربوں انسانوں کے بیچ کیا کوئی ایسا انسان پیدا ہوا ہے؟ چشم فلک حیراں ہے۔ دھرتی نازاں، ملائیک انگشت بدنداں، ماورائے فہم و ادراک، شہنشاہ لولاک، دُرِیتیم، اُمی جو مدینۃ العلم تھا۔ سراسر حلم تھا۔ ماہر فن حرب تھا۔ سیّد المرسلین، آں امام اوّلیں وآخریں.....!

حج یقیناً مشکل عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ان کی ہمت، استقامت، حوصلہ، خلوص اور نیت کا، احرام، طواف حرم۔ سعی صفا و مروہ، منزل، منیٰ، عرفات و مزدلفہ، رمی، حلق، عبادات، سفر در سفر، مادی فاصلے، روحانی مدارج، ایک بے نام سا خوف جو ہر امتحان کے وقت ذہن پر سوار رہتا ہے روح کانپ اُٹھتی ہے، جسم لرزہ براندام ہو جاتے ہیں لیکن جو امتحان اس کے بندے خلق خدا کا لیتے ہیں وہ زیادہ کڑا اور جاں گسل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو رحیم ہے رحمٰن ہے، در بخشش کبھی بند نہ ہوتا لیکن ان لوگوں کی لغت میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں ہوتا، کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ اس کار خیر کا آغاز تو محکمہ حج کرتا ہے اور انجام سراسر منطقی ہوتا ہے۔ کارپردازان حج کی طرف سے ہمیں جو ہدایت نامہ ملا اس کا اگر تفصیلاً ذکر کیا جائے تو پھر شاید پوری کتاب لکھنی پڑے۔

قصہ مختصر ہم ۱۲ فروری ۲۰۰۰ء کو جب حج ٹرمینل کے مرکزی لاؤنج میں پہنچے تو ایسے محسوس ہوا جیسے ایک برقی رو ہے جو چار سو دوڑ گئی ہے ایک لہر ہے جس نے مکینوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے ایک رعد ہے جس نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے جذبوں کو زبان مل گئی ہے۔ لبیک اللھم لبیک کی روح پرور آواز سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ رنگ برنگے لباس تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ پھر یوں لگا جیسے ایک دم بہت سے راج ہنسوں کے قافلے ہال میں اُتر گئے ہوں۔ سفید براق لباس، ایک ہی رنگ، ایک جیسی تراش خراش۔ لوگوں نے احرام باندھ لئے تھے اور خدائے لم یزل کے حضور سجدہ ریز ہو رہے تھے۔ دو رکعت نفل جس کی تلقین ہدایت نامہ میں کی گئی تھی۔ میں نے بھی احرام باندھ لیا اور سربسجود ہو گیا۔ جب دعا پڑھ کر سر اُٹھایا تو ایسے محسوس ہوا جیسے اندر جمی ہوئی صدیوں کی برف کو کوئی آہستہ آہستہ توڑ رہا ہے کائی کو کھرچ رہا ہے، کثیف شیشے کو صیقل کر رہا ہے۔ مجھے اپنا سارا وجود چٹختا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کون تھا؟ کون ہو سکتا تھا جو مجھے اس کیفیت سے گزار رہا تھا۔ وہی جو بادصبا کو خرام ناز سکھلاتا ہے۔ پھولوں کو رنگ اور خوشبو بخشتا ہے صبح کو نور عطا کرتا ہے، شام کی زلفیں سنوارتا ہے۔ انسان کی ہر سانس اور ہر حرکت کا حساب رکھتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے جب چاہے کایا پلٹ دیتا ہے۔

پی آئی اے کا جمبو جہاز حسب دستور چند گھنٹوں کی تاخیر سے پہنچا۔ یہ وہی جہاز ہیں جن کا یورپ میں داخلہ ممنوع ہو چکا ہے۔ IOTA نے جو معیار مقرر کر رکھا ہے یہ اس پر پورے نہیں اُترتے۔ حج کے موسم میں ان کی سنی جاتی ہے اور حاجیوں کو ان میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس کر جدہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاز تو پرانا تھا لیکن اس کا عملہ بدلا بدلا سا لگتا تھا۔ میں نے پی آئی اے کے سفر میں اس قدر مہذب اور با اخلاق عملہ کم دیکھا

ہے۔ شاید ماحول کا اثر تھا۔ وہ ہر مسافر کی خدمت عبادت سمجھ کر کر رہے تھے۔ گو سیٹیں بہت تنگ تھیں لیکن کسی کو بھی اس کی پروا نہ تھی ان کے دل اور دماغ کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔

حرف ناتمام: زندگی کے اڑسٹھ برس کسی نہ کسی طور بیت گئے ہیں۔ حسرتیں، اُمنگیں، آرزوئیں اور ارادے سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گئے ہیں۔ میں نے تینتالیس سال سروس کی ہے جو یقیناً ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس طویل سفر میں کئی نشیب و فراز آئے۔ اندھیروں اور اُجالوں کا انوکھا امتزاج دیکھا۔ محدود دائروں میں رہتے ہوئے بظاہر خاصی ترقی کی۔ اوائل عمر میں عشق بلا خیز کی گرمی سردی اور تلخی بھی محسوس کی۔ اکثر لوگ مجھے ایک کامیاب فیلڈ افسر سمجھتے ہیں۔ دس سال تک پنجاب کی ڈپٹی کمشنری، کمشنری، صوبائی سیکرٹری شپ، بورڈ آف ریونیو، پبلک سروس کمیشن، وزیراعلیٰ معائنہ ٹیم، چیئرمین لاہور آرٹ کونسل، بیرونی درس گاہوں میں تعلیم، بے شمار غیر ملکی دورے، نو کتابوں کی تصنیف، کالم نگاری، فن تقریر، پرائیڈ آف پرفارمنس، کسی صوبائی سروس کے سرکاری افسر کے لئے یہ سب کچھ حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ہزار راہ مغیلاں دامن تھامتے ہیں آبلہ پا بھی ہونا پڑتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی سینیس نہیں سمجھا۔ ہوں بھی نہیں! کوئی غیر معمولی صلاحیت بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ سازشی ذہن نہیں رکھتا، خوشامد سے کوسوں دور ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا فن ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ یہ اگر اتنا آسان ہوتا تو آج ہر دوسرا آدمی بام عروج پر پہنچ جاتا۔ Hypersensitive ہوں جو فی زمانہ مادی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تعلقات میں سرد مہری آ جاتی ہے۔ بسا اوقات اس کی ظاہری وجوہ بھی نظر نہیں آتیں۔ دل اور دماغ میں کوئی خیال گھس جاتا ہے جو بالآخر تن آور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ شاید بہت زیادہ نیکیاں بھی نہیں کمائیں۔ جہاں زندگی میں چند اچھے دوست بنائے وہاں اپنے مخالفین اور بدخواہوں کی ایک طویل فہرست بھی ہمیشہ جیب میں رکھی ہے۔ تندیٔ باد مخالف شاید عقاب کو تو اونچا اُڑنے کی ترغیب دیتی ہے لیکن کمزور پرندوں کو انجانے خطرات سے دوچار بھی کر سکتی ہے۔ یہ بڑی ظالم دنیا ہے۔ گرتے ہوئے کو ہر کوئی ٹھوکر مارتا ہے چڑھتے ہوئے سورج کے سب پجاری ہیں۔ ڈوبتی آگ کو کوئی بھی سلام نہیں کرتا۔ Struggle for existance اور Survival of the fit test ازل سے زندگی کے بنیادی اصول رہے ہیں۔ جب Law of jungle تھا

تو انھیں بروئے کار لانا پڑا تھا۔ اب جبکہ بظاہر انسان مہذب ہو گیا ہے تو بھی انھی پر کاربند رہ کے آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ اس اصول کو مدنظر رکھیں تو میں نے بھی خاصی جدوجہد کی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا۔ جب قسمت یاوری کرے تو کامیابی کے قفل خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔

شروع میں جب میں دھاندلی کی ابجد سے بھی ناآشنا تھا تو مجھے ایکشن ایکسپرٹ سمجھ لیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے ممبران اسمبلی سے شدید چپقلش کے باوجود نوکری سے برخواستگی کی تلوار مجھ پر نہ گر سکی۔ کسی وزیر یا سینئر افسر کو بدتمیزی کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔ سرائے عالمگیر کے ریسٹ ہاؤس میں ایک نوجوان افسر کا چار جغادری وزیروں سے ٹکرا جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ضیاالحق کے زمانے میں ایک سینئر وزیر نے مجھے ڈسمس کرانے کی بھرپور کوشش کی - ہر چیف سیکرٹری میرا مخالف رہا۔ انھیں یہ بات ہضم ہی نہ ہوتی تھی کہ کوئی پی سی ایس افسران کی مرضی کے بغیر کئی بڑے ضلعوں کا ڈپٹی کمشنر لگ جائے۔ میں نے انھیں رام کرنے کی کبھی کوشش بھی نہ کی۔ ''اس سے خیرات نہ مانگو کہ وہ گالی دے گا'' زندگی میں Out of the way تو نہیں گیا لیکن کچھ اتنا زیادہ صراط مستقیم پر بھی نہ چل سکا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ غیرقانونی کام تو نہ کیے لیکن Judiciouly & Discretion کو Capriciouly استعمال کرنے کی قسم بھی نہیں کھائی جا سکتی۔ پوری سروس میں کسی کو زرعی زمین الاٹ نہ کی خود بھی محروم رہا۔ اس کے باوجود فیروز والا لینڈ فراڈ کیس میں بری طرح اُلجھ گیا۔ ملزمان کو سزا تو دلوا دی لیکن اپنی صحت بھی خراب کر بیٹھا۔ گو وہ دور ابتلا تھا۔ ملزمان اور ملٹری عدالتیں یکجا اور یک زبان ہو گئے تھے لیکن میں نے کبھی قسمت سے گلہ نہ کیا۔ اس وقت بھی میرا یقین کامل تھا کہ مجھے کسی اور گناہ کی سزا اس صورت میں مل رہی ہے۔ مذہبی تعصب سے کوسوں دور ہوں۔ دہشت گردوں کی یلغار سے اب تک بال بال بچا ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ تو وہ میرے گھر تک پہنچ گئے۔ میں ایک دن پہلے ناروے چلا گیا۔ اس کا انکشاف ملزم نے پکڑے جانے کے بعد دورانِ تفتیش کیا۔ زندگی موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جہاں تک لاء اینڈ آرڈر کا تعلق ہے تو اگر میرا سگا بھائی یا بیٹا بھی امن عامہ میں خلل ڈالے گا تو بطور ایڈمنسٹریٹر میں اس کے خلاف سخت ایکشن لوں گا۔ یہ روش میری کمزوری بھی تھی اور کامیابی کا راز بھی۔ ہر کسی کو بخوبی علم تھا کہ

He means business

گزرے ہوئے اڑسٹھ برسوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ میرا بچپن اور لڑکپن

زیادہ تر تلہ گنگ میں گزرا۔ نوجوانی اٹک، پنڈی اور لاہور میں تعلیم کی نذر ہوئی اور بقیہ حصہ سروس کی پل صراط پر چلتے چلتے کٹا۔ جب بھی میں نے ان ادوار کا تقابلی جائزہ لیا ہے تو تلہ گنگ میں بیتے ہوئے دنوں کو بہترین پاتا ہوں۔ ان دنوں اس شہر میں بجلی نہیں تھی، ہاتھ والے پنکھے کے سوا کوئی چیز میسر نہ تھی۔ تمازت آفتاب سے ہر چیز سوختنی ہو جاتی۔ بارانی علاقہ ہونے کی وجہ سے پانی کی شدید قلت تھی۔ شہر سے باہر جانا ہوتا تو اکثر انہی تالابوں، چھپڑوں اور جوہڑوں سے میلا، گدلا اور بدبودار پانی پینا پڑتا جہاں سے جانور پیتے تھے۔ سواری کے لئے گھوڑے اور سائیکل کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔ ریت کی وجہ سے سائیکل چلانا بھی خاصا دشوار تھا۔ مگر وہ تفکرات سے پاک دن تھے۔ فکر فردا تھا نہ غم روزگار۔ کھیل کود کے سوا کسی بات کا سوچا تک نہ تھا۔ صبح سکول جانا اور پھر کھیل ہی کھیل، تفریح ہی تفریح - ہاکی، کرکٹ، کبڈی، پڑکوڈی، چوگان اور گلی ڈنڈا، چوری چھپے کسانوں کی بیریوں سے بیر توڑ کر کھانے کا جو مزہ تھا، وہ دنیا بھر کے پھلوں میں بھی نہ مل سکا۔ چاچے نورے کی ہٹی میں پڑی ہوئی ریوڑیوں کی مٹھاس اور ذائقہ چاکلیٹوں، آئس کریموں اور آج کل کی سویٹس سے کہیں بہتر تھا۔ انور لوہار کی دکان کا دودھ اور لسی سب کولوں اور جوسوں پر بھاری تھی۔ خانہ بدوشوں کے مٹی سے بنائے ہوئے کھلونوں اور مرلیوں سے نکلتی ہوئی رسیلی تانیں، سب شہنائیوں اور بانسریوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھیں۔

ناسٹلجیا! میرے بچے کہتے ہیں ''ہمیں حیرت ہے کہ آپ اس ماحول میں کیسے خوش رہتے تھے۔ نہ بجلی، نہ پانی، بغیر اے سی کے دن کیسے کٹتا ہوگا۔ راتوں کو نیند کیونکر آتی ہوگی۔ کیا آپ کو بستہ سر پر رکھ کر دو میل دوڑ کر سکول جانا عجیب سا نہ لگتا تھا؟ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب لوگ مٹی کی ہنڈیا میں کھانا پکاتے تھے اور بٹھل میں چھاچھ پیتے تھے۔ کیا آپ کو علم ہے کہ ہنڈیا سے آہستہ آہستہ گرتی ہوئی مٹی سیدھی معدے میں جا پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات میں رہنے والا ہر تیسرا آدمی درد گردہ کی شکایت کرتا ہے۔ گرمی میں پیدل چلنے سے ہیٹ سٹروک ہو سکتا ہے۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں سمجھانا عبث ہے۔ جن لوگوں نے بڑے شہروں میں آنکھ کھولی ہو، ایچیسن کالج اور لمز میں پڑھے ہوں۔ جو ہر وقت کاروں کے ماڈلز اور کوٹھیوں کے رقبے پر بحث کرتے ہوں انگریزی جن کا اوڑھنا بچھونا ہو وہ ناسٹلجیا کے لغوی معنی تو جانتے ہوں گے کبھی اس کی کسک محسوس نہیں کر سکتے۔ اس سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتے۔

☆☆☆☆☆

پنیر خمیر اور تبخیر

مجھے پرانی کہانیاں اور کلاسیکل لٹریچر بہت پسند ہے میں ان سے زندگی کے متعلق معاملات کے بارے میں رہنمائی اور استفادہ لیتا رہتا ہوں۔ اگر اردو مضمون کی کہانیاں آج کل کے نوجوانوں کو سنائیں تو انہیں ان کے بارے میں کوئی خاطر خواہ دلچسپی نہیں ہوتی لیکن پھر دوسرے طریقے سے انہیں سمجھانا پڑتا ہے حالانکہ اسی مضمون میں انہوں نے دس میں سے دس نمبر لے رکھے ہوتے ہیں۔ ایگزامینر سے اگر اسی بارے میں پوچھیں تو وہ کہتا ہے کہ اگر ان کی لکھائی اچھی ہوتی تو وہ نمبر مزید بڑھا بھی سکتا تھا کیونکہ بندہ بڑا دیانت دار ہے۔ ہوا یوں کہ دو بلیاں جنھیں دیارِ غیر سے کسی نے پنیر کا تحفہ بھیجا تو بجائے اسے آپس میں تقسیم کرنے کے وہ الجھ پڑیں اور پنجہ آزمائی کر کے آپس میں سینگ پھنسا بیٹھیں (یہاں دست و گریبان کا صیغہ استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک تو یہ متعلقہ سلیبس میں شامل نہیں دوسرا ایگزامینر یہ قدغن بھی لگا سکتا ہے کہ بلیوں کا دست و گریبان ہونے سے کیا تعلق)

چنانچہ جنگل میں قانون کے دائرے کے اندر رہنے والے دوسرے جانوروں کے لیے ان بلیوں کی دھینگا مشتی اور بے جا شور شرابے سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہونا شروع ہوا۔ دریں اثنا ان بلیوں کو کسی کے پیروں کی ''بندر اہٹ'' محسوس ہوئی انھوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر انھوں نے اپنے سامنے ''وزن دار'' بندر ایک ماہرِ قانونِ جنگل کی شکل میں اپنے سامنے پایا کیونکہ پورے جنگلی ماحول میں بس وہی درد دل رکھتا تھا اور اس کا مسکن بھی ان کے قریب ہی تھا۔ اس نے بلیوں سے ''درخواست'' کی اور کہا کہ آپس میں لڑ لڑ کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتی ہو اور تم نے یہاں ''بلو دھم'' مچا

علی رضا احمد

رکھا ہے۔ سیدھا میرے پاس آؤ۔ میں کس لیے سارا دن اونچی چھلانگیں لگاتا ہوں اور لمبی چھوڑتا ہوں میری بل کھاتی ہوئی دانشمندی کس دن اور کس کے کام آئے گی۔

I'am wating for your best company میرے پاس آیئے ہم آپ کے اس معمولی جھگڑے کو فوری نمٹا دیتے ہیں۔ بلیوں نے دل میں سوچا یہ کتنی اچھی vision رکھتا ہے اتنا مصروف وقوف اور معروف ہونے کے باوجود یہ ہمارہ قضیہ نمٹانے کی کوشش میں ہے لگتا ہے اس کے اندر اب ''حیوانیت'' جنم لے چکی ہے۔

چنانچہ وہ دونوں اپنا جھگڑا ختم کرانے کی کوشش میں خوشی خوشی سے اس کے ہاں حاضر ہوگئیں۔ بندر نے ادھر ادھر دیکھا اسے کوئی بیٹھنے کے لیے کوئی اونچی جگہ یا بنچ نظر نہ آیا اس نے فوراً امرود کے درخت کے نیچے بیٹھک لگانے کا فیصلہ کیا تا کہ بلیوں کو چھچھڑوں کے علاوہ ''امرودیت'' سے بھی کچھ واقفیت ہو۔ اس نے جس درخت کا انتخاب کیا تھا اس پر ایک نوٹس بورڈ لٹک رہا تھا جس پر لکھا تھا ''دیکھیں مت سنیں''

پھر اچانک بندر نے بڑی چابک دستی سے پنیر کا اختلافی ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دو ٹکڑے کر کے اپنے سامنے رکھے ترازو کے پلڑوں میں ڈال دیا۔ بلیوں نے دیکھا کہ ایک پلڑا دوسرے سے بھاری ہے۔ بندر نے بڑے محتاط انداز میں بھاری والے پلڑے سے پنیر کا ٹکڑا اٹھایا اور اس کو اپنے موتیوں کی طرح چمکتے دانتوں سے کاٹا اور پھر اسے دوبارہ پلڑے میں ڈالا۔ حالانکہ اس نے بڑے سلیقے قاعدے اور قواعد کی روح کے مطابق پنیر کو چبایا تھا تا کہ دونوں ٹکڑے باہم وزن ہو جائیں لیکن ایک ٹکڑا ذرا زیادہ کٹ گیا اور لذیز ہونے کی وجہ سے بندر نے اسے ہڑپ بھی کر لیا۔

بندر نے ان دونوں ٹکڑوں کو دوبارہ پلڑے میں ڈالا تو اسے محسوس ہوا کہ دونوں پلڑے ابھی بھی برابر نہیں ہیں۔ اب اس نے وزن برابر کرنے کے لیے دوبارہ بھاری والا ٹکڑا اٹھایا اور اسے اپنے غنچہ دہن میں لے کر دوبارہ چبایا تا کہ اس میں سے کچھ کم کر کے پلڑوں میں رکھا جائے اور وہ جلدان کا فیصلہ بھی کرے اور فریقین کو راضی کرے۔ بلیاں سمجھ رہی تھیں کہ اس میں بندر کی بدنیتی کا کوئی عمل دخل نہیں لیکن اس نے فریقین کے لیے کوئی حل بھی نکالنا تھا۔ لیکن ہر بار یہی ہوتا رہا بندر اپنی پوری کوشش کرتا رہا لیکن

پنیر بھی پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ برابر ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ پنیر کی اپنی ایک ''کلاس'' ہوتی ہے یہ نجانے کتنے بچوں کی بھوک چھین کر بن پاتا ہے اور پھر چند ہائی کلاس لوگوں کے پیزے کے کام آتا ہے۔

بہرحال دونوں بلیاں بے چینی سے سارا جغرافیائی اور منصفائی منظر دیکھ رہی تھیں۔ یہ پنیر چونکہ دیارِ غیر سے بطور تحفہ آیا تھا اس لیے اس میں کوئی برکت و وسعت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بندر نے اپنی آخری حد تک جا کر انصاف برپا کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنے دانتوں کی دانست کے مطابق تھوڑا بہت چبا کر برابر تقسیم کرنے کی کوشش کر بھی کر لی حالانکہ اس کا وجود اسے ہضم کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا مگر اسی کشمکش میں تمام اختلافی پنیر بھی ختم ہو کر بندر کے معدے میں جا پہنچا ورنہ بندر کے لیے یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا کہ وہ اس جھگڑے کا کوئی معقول فیصلہ نہ کر سکے۔ اب دونوں بلیاں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں اور دل ہی دل میں یہ کہہ رہی تھیں کہ کاش کہیں سے تھوڑا سا مزید پنیر مل جائے تا کہ بندر کو کوئی شکی نہ ہو اور وہ ہمارا مسئلہ بھی حل کر دے مزید یہ کہ ہمیں عدلی بدلی اور جنگلی شرمندگی سے نجات بھی دلا دے مگر ہمارا حال'' ہم علاج کروانے جائیں اور لنگڑاتے واپس آئیں'' والا ہے۔ بندر مزید یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سائلات ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں ایسے ٹیڑھے مسائل کا حل تو میرا شب دروز کا اور دائیں جبڑے کا کام ہے بظاہر اس کا یہ وہم بھی تھا کہ ایسے ریکارڈ تو میں ہر روز بناتا ہوں مگر وہ اندر اندر سے کچھ پریشانی میں مبتلا بھی تھا کیونکہ اس نے جنگل میں پنیر کے دو عدد ٹرک بھی چھپا رکھے تھے۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ بلیاں دیگر جانوروں کو اپنے ساتھ ملا کر کہیں اس کے خلاف کوئی پریشر گروپ ہی نہ بنا لیں۔ دراصل انصاف کی کوئی زبان یا وطن نہیں ہوتا وہ جہاں بھی میسر آ جائے اس کا بول بالا ہو جاتا ہے بعض اوقات اس کی ''خاموشی'' کا بھی اس وقت بول بالا ہو جاتا ہے بشرطِ سائلین اپنے مسائل خود ہی حل کر لیں اور آپ کو کہیں انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانا ہی نہ پڑے مگر بدقسمتی سے بلیوں کو کسی قسم کا سسٹم بھی سپورٹ نہیں کر رہا تھا۔ بلیاں دبے الفاظ میں بندر کو صرف یہ سوال کر کے جنگل کی طرف سرپٹ دوڑ گئیں کہ ڈارون کی تھیوری کے برعکس صرف تیرا ارتقائی عمل ہی کیوں راستے میں رک گیا کاش تو بھی؟ گھبرائی ہوئی بلیوں کو

ذہن میں یہ تھا:

تالاب میں رہ کر مگر مچھ سے بیر
بندر کیا جانے سمندر کی سیر

.....

گزشتہ روز جب یہ کہانی میں نے وقار مجروح کو سنائی تو کہنے لگا اگر پنیر کی جگہ کھانے کی کوئی اور چیز ہوتی تو شاید بندر اتنی جلدی یہ معاملہ ختم نہ کرتا اور انہیں اگلی تاریخ دے دیتا۔ پوچھا گیا کونسی چیز؟ کہنے لگا ''چیز''۔ دیگر جانوروں کو اس کی طرف سے کیا گیا انگریزی ترجمہ بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ معاملہ بلیوں کا تھا زبان کا نہیں۔ اس دوران خرگوشوں کا ایک اور جوڑا آپس کے خانگی اور اختلافی مسائل لے کر اپنے تین معصوم بچوں کے ساتھ اسی بندر کے پاس آیا تا کہ وہ ان کے بچوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس کے ساتھ رہیں گے۔ بلیوں نے بڑے بچے کو سہلاتے ہوئے خرگوش کے کان میں کہا کہ ابھی اطمینان سے دوبارہ اپنی بلوں میں جا گھسو اور اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک ان کی تعداد آٹھ یا چار تک نہ پہنچ جائے مگر جاتے جاتے خرگوش نے بندر سے کہا اوہ بلنڈرا! تو کہاں کا بیرسٹر بنا بیٹھا ہے جھانسے کا پنیر کھا کے اب تیرے دماغ میں تبخیر اٹھ رہی ہے تیرے تو خمیر میں ہی ''حیوانیت'' نہیں ہے۔ اب سارا جنگل تجھے جان گیا ہے کہ تو کیا ہے۔ بندر آگے سے کہنے لگا بلیاں بھی تو کسی کا پنیر چرا کر لائیں تھیں -- چور کہیں کی --- مزید کہنے لگا الزام لگانا میرا کام تھا ثبوت دینا ان کا کام ہے --- اسی دوران جانوروں کا ایک اور جوڑا گوشت کا ٹکڑا لیے اس کے پاس آیا تو بندر ان سے کہنے لگا تم کل میرے پاس آنا آج میں مزید عدالت نہیں لگا سکتا کیونکہ مجھے ''فلو'' ہو گیا ہے حالانکہ اسے فلو نہیں وہ ویسے ہی ''Full'' ہو گیا تھا --- دیسی مرغے سے نہیں پنیر سے۔ دریں اثنا اس نے پھر ایک نیا ضابطہ اخلاق جاری کیا کہ اگلے منگل تک اس کو جنگل میں منگل منانا ہے لہذا بلیاں دم سادھے..... قبل ازیں اس نے ایک بندرگاہ کے قریب پنسار کی دوکان کھول رکھی تھی۔ اب یہ ''ٹین کا بندر گھر کے اندر'' ہی مالا پہننے الٹا لٹکا رہتا ہے۔ بقول اس کے اگر میرا جیون بھارت میں امرت ہوتا تو میرا ہنومان سے کم درجے پر سواگت نہ ہوتا۔ ان کہانیوں سے یہ سبق ملتا ہے کہ اپنے جذبات جزیات اور کیفیات کو ہمیشہ قابو میں رکھیں اور اپنے معاملات دوسروں کے ہاتھوں میں نہ دیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

بہت گل پیرہن تھے شہرِ گل میں
وہاں ہم بھی تھے لیکن تو نہیں تھا

ہماری سوچ کے آفاق پر بھی
ستارے تھے ، کوئی جگنو نہیں تھا

ہماری سیرتیں تھیں ایک جیسی
کوئی خوش رُو کوئی کم رُو نہیں تھا

ہمارے قہر ٹوٹے تھے ہمیں پر
ہمیں حالات پر قابو نہیں تھا

ہوا کا ہاتھ کیوں کر تھام لیتے
کہ یہ بازو ترا بازو نہیں تھا

بس اک آواز پر تو لوٹ آتا
کسی کے پاس یہ جادو نہیں تھا

کسی کی جیب میں پیسے نہیں تھے
کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا

تبھی تاثیر تھا ہر شعر خالد
کسی جنگل میں یہ آہو نہیں تھا

خالد احمد

غزل

دِل ہو تھکن سے چُور، سہارا کہیں نہ ہو
بھٹکیں تو دُور دُور، اشارہ کہیں نہ ہو

رُوئے زمیں پہ ہو نہ شبوں کو کوئی چراغ
دستِ فلک پہ کوئی ستارہ کہیں نہ ہو

کُھلتا نہ ہو کہ کِس نے بلایا ہمیں یہاں
بس انجمن ہو، انجمن آرا کہیں نہ ہو

چشمک سی برق کی ہے گزرتا ہوا خیال
اِک بار ہر کہیں ہو، دوبارہ کہیں نہ ہو

وسعت بھی ایک چیز ہے، یہ بھی بُری نہیں
لیکن نہ اِس قدر کہ کنارہ کہیں نہ ہو

اب تم کہیں ملو تو کریں مِل کے اُس کو یاد
جو وقت ہم نے ساتھ گزارا کہیں نہ ہو

خورشید میرے دل کو سُنا اپنا دردِ دل
تُو نے اگر یہ بوجھ اُتارا کہیں نہ ہو

خورشید رضوی

غزل

اس طرح صورتِ دشوار نکل آتی ہے
گھر کے کونے سے بھی دیوار نکل آتی ہے

اس کو جب ہم نے تغزل کی نظر سے دیکھا
آرزو حسرتِ دیدار نکل آتی ہے

کس طرح اپنے عزیزوں کو بچایا جائے
شاخ در شاخ یہاں دار نکل آتی ہے

اس کا ہلکا سا اشارہ جو سرِ موج چلے
دل کی کشتی مری اس پار نکل آتی ہے

طنز اور لطف میں تفریق نہیں ہو سکتی
تیری ہر بات مزیدار نکل آتی ہے

کیا تماشا ہے کہ جو تیر چلا ہے دل پر
اس کے پیچھے مری سرکار نکل آتی ہے

اب خموشی ہی قرینہ ہے ہمارا ثاقب
بات کرتے ہیں تو تلوار نکل آتی ہے

آصف ثاقب

غزل

دوست دشمن سب ہمیں سمجھاتے ہیں
ہم اُنھیں خاطر میں تھوڑی لاتے ہیں

عرض کرتے ہیں ہم اُن سے اور کچھ
وہ جواباً اور کچھ فرماتے ہیں

ہم نہیں کوئی طفیلی یا فقیر
اپنی محنت سے کماتے کھاتے ہیں

اُن کی آمد اصل میں آورد ہے
وہ ہماری کوششوں سے آتے ہیں

ہم سُناتے ہیں ترنم سے غزل
کون جانے روتے ہیں یا گاتے ہیں

ہر خلافِ مصلحت اقدام پر
ہم خود اپنے آپ کو اُکساتے ہیں

گو نہیں خود کوئی دانشمند ہم
بیوقوفوں سے بہت گھبراتے ہیں

حق طلب کرتے ہیں جینے کا غلام
اور آقا گولیاں برساتے ہیں

ہم کہیں جاتے نہیں گھر سے شعور
جائیں بھی تو اُس گلی تک جاتے ہیں

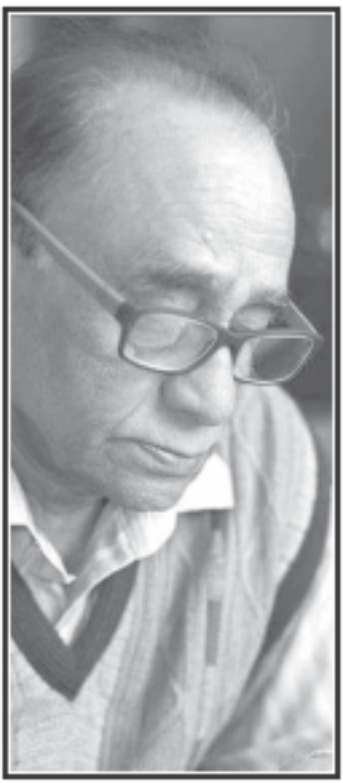

انور شعور

غزل

جیسے دُکھ جھیل کے مُکھ اپنے چمک جاتے ہیں
وہ جو سوچیں بھی تو دل اُن کے دھڑک جاتے ہیں

یہ کشاکش فقط اندر ہی کا جھگڑا نہیں ہے
سلسلے اِس کے بہت دُور تلک جاتے ہیں

جب ذرا چاند ستارے کی دمک بڑھتی ہے
کتنے ماتھے ہیں جو اک ساتھ ٹھنک جاتے ہیں

گھیر لیتی ہے بہت جلد اُسے ویرانی
پھل اگر پہلے کسی پیڑ کے پک جاتے ہیں

بیٹھتے بیٹھتے ہی گردِ گماں بیٹھتی ہے
کہاں کب دل میں سمائے ہوئے شک جاتے ہیں

تیرے پا مرد ہیں یا ڈھیر دُھنی روئی کے
سرسری موجِ ہوا سے بھی سرک جاتے ہیں

کبھی بارش کی طرح پوری غزل آتی ہے
کبھی ہفتوں کسی مصرعے پہ اٹک جاتے ہیں

جلیل عالی

غزل

زندگی تجھ سے ہوا پہلا سخن وصل کے بعد
جی رہا ہوں میں اسی دھن میں مگن وصل کے بعد

یاد انگڑائیاں لیتی ہے تو یوں لگتا ہے
جیسے لہرا کے گزرتی ہے پون وصل کے بعد

ذوق نظارہ کو کم کم تھی مری تاب نظر
پیاس بڑھتی گئی جلنے لگا تن وصل کے بعد

گیسوؤں کی وہ مہک تھی کہ چمن جھوم اٹھا
جھومنے گانے لگے سرو و سمن وصل کے بعد

رقص کرتی ہوئی تنہائی پسِ چلمن خواب
گنگنا تا ہوا ہر موئے بدن وصل کے بعد

پھول بنتی ہوئی مٹی ترے پیروں کے تلے
ذرہ ذرہ نظر آتا ہے چمن وصل کے بعد

رات بھر کم تو نہ تھی لذت شیرینیِ لب
صبح تک توبہ شکن، توبہ شکن وصل کے بعد

رک گیا کون سی منزل پہ دلِ خانہ بدوش
اپنے اپنے سے لگے کوہ و دمن وصل کے بعد

دل کی دھک دھک پہ کیا رقص محبت نے کنور
پائلیں بجنے لگیں چھن چھنا چھن وصل کے بعد

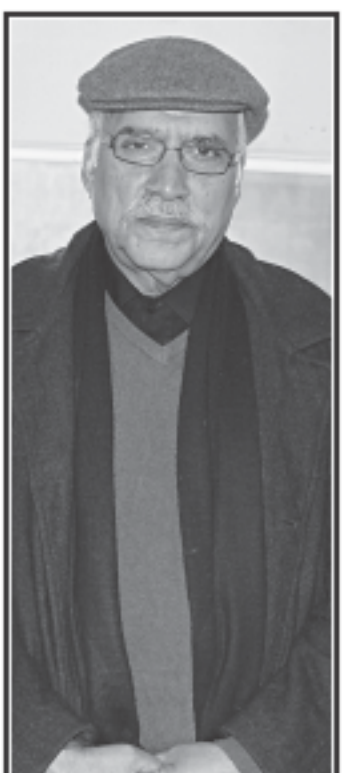

اعجاز کنور راجہ

غزل

ستارے دان کرتی ہے نظر کو ناز دیتی ہے
سخن دیوی ہے وہ دیوی جو یہ اعزاز دیتی ہے

مجھے شاداب رکھتا ہے سدا تیری محبت نے
جدھر جاؤں تری خوشبو مجھے آواز دیتی ہے

گماں کی سخت راہوں میں بھٹکتے ہر مسافر کو
یقیں کی بے بدل طاقت پرِ پرواز دیتی ہے

ترا کردار ایسا ہے وفا کی داستانوں میں
جو سنتا ہے اُسے اپنی وفا آواز دیتی ہے

ادب کے خشک صحرا میں کنول کھلتے ہیں لفظوں کے
غزل کی شاہ زادی جب سخن اعجاز دیتی ہے

مرے سائیں! مرے مہران کی یہ مہرباں دھرتی
سچل سرمست دیتی ہے تخی شہباز دیتی ہے

اِسے اپنی غرض ہی کھینچ لاتی ہے کناروں پر
وگرنہ موجِ دُنیا ہے یہ کب اعزاز دیتی ہے

یہ دل والوں کی بستی ہے یہ اپنے ملنے والوں کو
کبھی ہم دم کبھی ہم سر کبھی ہم راز دیتی ہے

یہ خوشبوخوں کے رشتوں کی کبھی پھیکی نہیں پڑتی
یہ جیون کی کہانی کو نیا انداز دیتی ہے

نثار ترابی

غزل

ہوا کے سامنے روشن دیا ہے
مقابل کا بھی دم خم دیکھنا ہے

پر پرواز ہے آندھی کی زد میں
کمال حوصلہ کا معرکہ ہے

اگر آغاز ہو تدبیر احسن
تو خیر کل یقیناً انتہا ہے

زبان دل تحمل مانگتی ہے
نگاہ بے محل کو ہر سزا ہے

شجر کی یہ ثمرداری تو دیکھو
گھنیری چھاؤں میں میلہ لگا ہے

رویہ خیر خواہی کا ہمارا
نہیں معلوم کیوں کھلنے لگا ہے

خبر اخبار کی ہے خون آلود
عجب دھڑکا دلوں کو آلگا ہے

فضاؤں میں کثافت کے ہیں ڈیرے
نفاست دم بخود، بے آسرا ہے

ہوائے نفس کی اونچی اڑانیں
جفا کیشی کا لاحق عارضہ ہے

نظر ایسی لگی ہے سرخوشی کو
ہماری جلوت و خلوت خفا ہے

عطائے مدعا شکل غزل میں
ریاض صدق کا حاصل ہوا ہے

سید ریاض حسین زیدی

غزل

سُونے آنگن میں دن گزرتا ہے
کتنی اُلجھن میں دن گزرتا ہے !

دل کے اندر چھپا ہوا ہے کوئی
دل کی دھڑکن میں دن گزرتا ہے

کاش ایسے ہر ایک دن گزرے
جیسے بچپن میں دن گزرتا ہے

شوق ہے اس قدر الجھنے کا
خود سے اَن بَن میں دن گزرتا ہے

یاد آئے وہ گل بدن جب بھی
میرا گلبن میں دن گزرتا ہے

اِس زمانے کے قید خانے میں
ایک روزن میں دن گزرتا ہے

مسئلہ کوئی حل نہیں ہوتا
کنفیوژن میں دن گزرتا ہے

زور کچھ اس قدر ہے گرمی کا
جیسے اوون میں دن گزرتا ہے

جس پہاڑی پہ چڑھ نہیں سکتا
اس کے دامن میں دن گزرتا ہے

میں ہوں غالبؔ کا پیروکار نسیمؔ
اِک لڑکپن میں دن گزرتا ہے

نسیمِ سحر

غزل

جی کہاں اس کا گل و برگ سے ہٹنا چاہے
بیل سرسبز درختوں سے لپٹنا چاہے

دور والے نہ رکھیں لطف و کرم کی خواہش
پاس ہی فیض ثمردار کا ہٹنا چاہے

اس لیے گھر سے نکلتا ہوں میں تیشہ لے کر
جانے کب سنگ کوئی راہ میں کٹنا چاہے

ذہن سمجھے جسے مسدود سفر کی خاطر
شوق اسی جادۂ مشکل سے نمٹنا چاہے

اس حقیقت کا کھلا بھید شبِ باراں میں
ابر جی بھر کے برستے ہوئے چھٹنا چاہے

سننے والوں کی توجہ ہی بتا سکتی ہے
داستاں پھیلنا چاہے کہ سمٹنا چاہے

کھینچ لیتا ہے نظر کو رُخِ زیبا گلزار
ہدف اچھا ہو تو کیوں تیر پلٹنا چاہے

گلزار بخاری

غزلیں

گزرے ہیں کتنی بار گزرگاہ خواب سے
یہ چل رہا ہے سلسلہ عہدِ شباب سے

امکان ہے کہ شعبدہ بازی کے دور میں
ہڈی کوئی نکال کے رکھ دے کباب سے

غائب ہوا وہ آنکھ جھپکنے سے پیشتر
پوچھا جو سر اٹھانے کا مطلب حباب سے

اوڑھے ہوئے ہوں ماں کی دعاؤں کا سائباں
امیدِ خیر رکھتا ہوں بپھرے سحاب سے

آساں نہیں مغنیِ مشاق کے لیے
نغمہ کوئی نکالنا ٹوٹے رباب سے

ہر عہد کی نگاہ میں، مَیں ناگزیر تھا
خارج نہ کوئی کر سکا مجھ کو نصاب سے

جس کا وفور رنگ میں گھبرا رہا ہو دل
کیسے کرے کشید وہ خوشبو گلاب سے

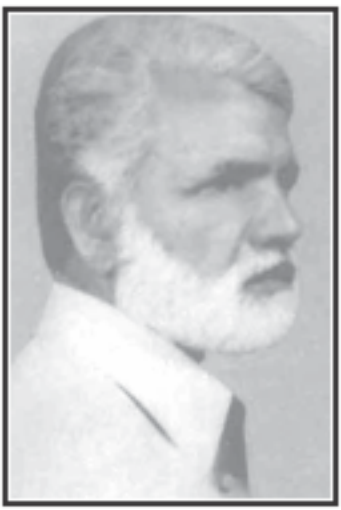

یعقوب پرواز

پیری میں ڈھل رہی ہے جوانی طیور کی
ہونے کو ہے تمام کہانی طیور کی

رکھتے ہیں پُرفضا یہ فضائے خیال کو
سو ہم سے دوستی ہے پرانی طیور کی

صیادگی ہے گھات میں آنکھیں تو کھولیے
روکے گا کون نقل مکانی طیور کی

کافی ہے شرحِ صدر کو ان کا معاملہ
نصرت کی ہے نوید کہانی طیور کی

شہرِ سبا پہ کون ہے پرواز جلوہ گر
روشن ہوئی ہے بات زبانی طیور کی

غزل

ملو تو ایسے جدائی کا کچھ گماں نہ رہے
بہار ایسی ہو اندیشۂ خزاں نہ رہے

وہ کامیاب محبت ہے جس کی نظروں میں
نہ سود، سود رہے اور زیاں، زیاں نہ رہے

یہی جو طورِ جفا کوشیٔ جہاں رہا
تو چند روز میں شاید یہ نیم جاں نہ رہے

ستم ظریف! تری بدگمانیاں نہ گئیں
تب اعتبار کرو گے جو ہم یہاں نہ رہے

جہاں رہے وہیں کعبہ بنے رہے دل کا
وہاں بھی ان کی پرستش رہی جہاں نہ رہے

بہک گئے ہو محبت میں کس قدر ساجد
کرو گے کیا جو محبت کے قدرداں نہ رہے

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی ، کرتا بھی تو کیا میں
سو ، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

یہ کاروبارِ محبت ہے ، کیا اُدھار چلے
گئے وہ جیت، یہاں نقدِ جاں جوہار چلے

جہاں سے داد کے طالب ہیں ہم، دمِ آخر
جو زندگی نہ گزرتی تھی ، وہ گزار چلے

نکل کے آنکھ سے اشکِ رواں، دمِ رخصت
جو ہم پہ قرضِ محبت تھے، سب اُتار چلے

ہے اہلِ حق کی یہی منزلِ عروج جلال
جفائیں سہ کے جو سُوئے فرازِ دار چلے

خوشی کے وقت، اُٹھائے گئے نہ کاندھوں پر
جہاں سے ہو کے، جو کاندھوں پہ اب سوار چلے

نہیں وہ جانتے ہم پُختہ فکر ہیں، جو لوگ
ہماری بگڑی ہوئی عادتیں ، سنوار چلے

خزاں مزاج ہو گلشن، تو اس میں ہے بے کار
ہزار بار اگر ، بادِ نوبہار چلے

کریں رقیب سے کیا شکوہ، اے بُتِ بے رُخ
تِری گلی سے جو ہو کر، ذلیل و خوار چلے

کسی سے غیر کا شکوہ کریں وہ اب کیسے
وہ جن پہ وار خود اپنوں کے بار بار چلے

سیّد قاسم جلال

غزل

جو موجیں تھیں ہماری تھیں، جو دھارے تھے ہمارے تھے
ترے طرفین میں جتنے، نظارے تھے، ہمارے تھے

بچھڑ کر تم کو یہ، احساس بھی تو، ہو گیا ہو گا
تمہارے پاس، جتنے بھی، سہارے تھے ہمارے تھے

بلندی پر اُڑا کر لے گئی ہم کچھ نہ کر پائے
ہوا کی دسترس میں جو غبارے تھے، ہمارے تھے

تھیں جتنی چاندنی راتیں، تمہارے نام کر دی تھیں
تمہارے ساتھ جتنے دن، گزارے تھے ہمارے تھے

اجالے بھی پرائے ہو گئے ہیں چند لمحوں میں
ابھی کچھ دیر پہلے جو ستارے تھے ہمارے تھے

میسر تھے اُسے اقبال تاریکی میں کچھ جگنو
مگر جتنے محبت میں خسارے تھے ہمارے تھے

اقبال سروبہ

غزل

کھونے نہیں دیا ہے جسے مِل نہیں رہا
گہرا نہیں ہے زخم مگر سِل نہیں رہا

ایسا نہیں کہ حسن مجھے کھینچتا نہیں
ایسا نہیں کہ سینے میں اب دِل نہیں رہا

اُس نے کہا دکھایئے کچھ اختیار دل
میں نے کہا کہ اب مجھے حاصل نہیں رہا

ڈھے سا گیا ہوں پیری سے پہلے مثالِ خس
اور اِس لیے کہ مدِ مقابل نہیں رہا

ہے اَشک سے قرینۂ دیدار کو نشاط
رونق نہیں کہ رونقِ محفل نہیں رہا

کارِ حیات زینۂ ردّ و قبول ہے
موجوں میں آ گیا ہوں تو ساحل نہیں رہا

اب روؤں جبر کو یا ہنسوں اختیار پر
اُٹھا قدم تو لائقِ منزل نہیں رہا

تقسیم سے ہی ملتی نہ تھیں فرحتیں مجھے
خوش ہوں کہ میرے ساتھ مرا دل نہیں رہا

بین السطور شوقِ اذیت تو دیکھیے
اُن کو گلہ ہے مجھ سے کہ بسمل نہیں رہا

اِک شعر کار گاہِ تخیل میں قید ہے
اِک پھول کوہ میں ہے مگر کھل نہیں رہا

تم مجھ سے کہ رہے ہو کروں زیرِ کائنات
میرے لیے تو عشق بھی مشکل نہیں رہا

مت گایئے فضول یہاں طائرانِ ہجر
اب نوحہ ان کو نغمۂ کامل نہیں رہا

فرحت عباس شاہ

غزل

اتنا مسرور نہ ہو توڑ کے ٹھوکر سے مجھے
ٹوٹ کر اور جِلا ملتی ہے اندر سے مجھے

جیسے وہ رات بچھی ہو مری چادر کی جگہ
آج بھی تیری مہک آتی ہے بستر سے مجھے

سارا دن بھی وہ تعاقب میں رہا ہو جیسے
رات کو نیند نہیں آئی تھی جس ڈر سے مجھے

کیا ضروری تھا کہ تصویر کو کاٹا جاتا
تم تو ویسے بھی ہٹا سکتے تھے منظر سے مجھے

جانے کس دور کے لوگوں کو عطا ہو وہ نظر
دیکھ کر زندہ نکالے گی جو پتھر سے مجھے

نام بیٹے کے تو کر آیا ہوں لیکن کل کو
کر دیا جائے نہ بے دخل اسی گھر سے مجھے

آہ معلوم نہیں کس کی تھی راحت جس نے
خشک تالاب بنا ڈالا سمندر سے مجھے

راحت سرحدی

غزل

وہ 'آج' کیوں نہیں رہا، 'کل' کیوں نہیں رہا
جو دن گزر چکا ہے وہ ڈھل کیوں نہیں رہا

دُنیا چلا چلا کے تھکا ہارا آدمی
اب گھر چلا رہا ہے تو چل کیوں نہیں رہا

میں نے کہا خدا سے، خدا نے کہا مجھے
گھر سے کوئی گلی میں نکل کیوں نہیں رہا

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے ڈگمگا گیا
اب اُس سے کیا گلہ کہ سنبھل کیوں نہیں رہا

جو نام بھی بدل چکا، گھر بھی بدل چکا
اُس کا پتا وہی ہے، بدل کیوں نہیں رہا

تو نے تو مجھ کو پھینک دیا اپنی آگ میں
اب آگ ہی سے پوچھ میں جل کیوں نہیں رہا

میرا شریکِ گریہ کہاں رہ گیا ہے پھر
گریہ مرا اٹل تھا، اٹل کیوں نہیں رہا

تو نے معاف کر کے یہ کیا کر دیا مجھے
ماتھے پہ تیرے بل تھا، وہ بل کیوں نہیں رہا

دامن بدلتا رہتا ہے اک صاحبِ لباس
دامن کے ساتھ داغ بدل کیوں نہیں رہا

شاہین عباس

غزل

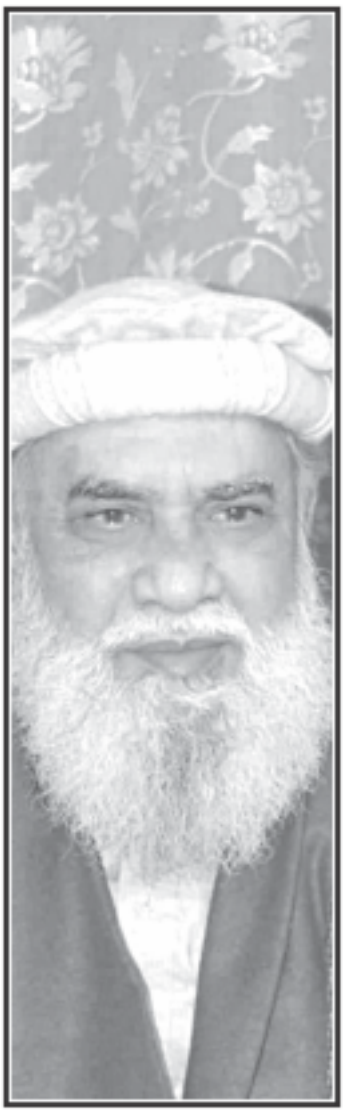

غموں کے بوجھ کو سر پہ سوار کرتے ہوئے
میں بھول بیٹھا تھا دنیا سے پیار کرتے ہوئے

جو اس نے غصہ دلانے کو اک جسارت کی
تو ہاتھ رک گیا دشمن پہ وار کرتے ہوئے

پُر اعتماد تھا جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو
وہ اعتماد مرا تار تار کرتے ہوئے

جو گھونسلے میں ہیں بچے اب ان کا کیا ہوگا
کسی نے سوچا پرندے شکار کرتے ہوئے

برہنہ کر کے درختوں کو اس نے چھوڑ دیا
کہا تھا کس نے خزاں کو بہار کرتے ہوئے

زمیں پہ پھیل گیا اس کا کاروبار اکرم
خدا کو بھول گیا دو کو چار کرتے ہوئے

اکرم ناصر

غزل

مرتا کیا نا کرتا میں
کتنا تجھ سے ڈرتا میں

اتنے سارے رنگوں میں
تصویریں تو بھرتا میں

پل پل ایک ہی زینے پر
چڑھتا اور اترتا میں

آخر کو اقرار کیا
کتنا روز مکرتا میں

رتی بھر مختار نہیں
پھر بھی کرتا دھرتا میں

دل کی حالت غیر ہوئی
کتنا اور سنورتا میں

پتھر کی دیواروں سے
کتنی باتیں کرتا میں

دنیا چڑھتے سورج کی
لیکن وقت گزرتا میں

ڈوبنا میری فطرت تھا
کتنا اور اُبھرتا میں

مسعود احمد

غزلیں

زاہد فخری

ایک مدت سے زبوں حال ہوں لاچار ہوں میں
جیسے ٹوٹے ہوئے گھر کی کوئی دیوار ہوں میں

یہ الگ بات کہ پہرے ہیں مری سوچوں پر
اور کہنے کو تو اس قوم کا فنکار ہوں میں

کیسے کترا کے مری رہ سے گزر جاتے ہو
گزرے وقتوں کا ترا پیار ہوں دلدار ہوں میں

اپنے سینے سے لگا اشک کبھی پونچھ مرے
روزِ اوّل سے مرے یار ترا یار ہوں میں

میرے اجداد نے چاہت میں تری چھوڑا وطن
اے مری مٹی سدا تیرا وفادار ہوں میں

ویسے فخری مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں سبھی
پھر بھی کچھ لوگ سمجھتے ہیں سمجھدار ہوں میں

میں دریا ہوں مگر میرے کنارے گم ہوئے سارے
میں جن کے ساتھ بہتا تھا سہارے گم ہوئے سارے
میں ایسی رات ہوں جس میں کوئی جگنو نہیں باقی
کہ میری روشنی کے استعارے گم ہوئے سارے
میں ایسی نیند ہوں جس کو میسر ہی نہیں آنکھیں
جو سپنے ساتھ لاتے تھے ستارے گم ہوئے سارے
میں وہ بچہ ہوں جس کی ایک بھی خواہش نہیں زندہ
مرا بچپن کھلونے اور غبارے گم ہوئے سارے
میں وہ یوسف ہوں جس کو کارواں ملتا نہیں اپنا
جو مجھکو دل سے اور جاں سے تھے پیارے گم ہوئے سارے

میں ایسا پیڑ ہوں شاخیں نہ جس کی چھاؤں ہے باقی
مرے پھل پھول جس جس نے اتارے گم ہوئے سارے
میں ایسا ملک ہوں جو لٹ گیا اپنوں کے ہاتھوں سے
کہاں ہے وہ جو مجھ کو پھر سنوارے گم ہوئے سارے
کوئی تو ہو جو اپنے خون سے سینچے مری مٹی
یہاں اب کون مجھ پہ جان وارے گم ہوئے سارے
اب اس کے شہر میں فخری ہماری کون سنتا ہے
کوئی اس شور میں کس کو پکارے گم ہوئے سارے

غزل

آخرِ کار تری زلف کو سر ہونا ہے
یعنی پتھریلی فصیلوں میں بھی در ہونا ہے

نفرت و جنگ کے امروز اگر شعلے ہیں
کل یہ معمورہ مگر پریم نگر ہونا ہے

تاب خورشید کی مانند ہے ایماں میرا
سنگ زادوں کو کبھی آئینہ گر ہونا ہے

خوف کے سائے سدا یوں ہی نہیں رہنے ہیں
یہ محل ظلم کا اک روز کھنڈر ہونا ہے

روکھی سوکھی بھی میسر نہیں جن کو امروز
ان کی تقدیر میں کل لقمۂ تر ہونا ہے

آج بے طرح جیئے جاتے ہیں جو لوگ مرے
کل انہی کے لیے یہ زیست ہنر ہونا ہے

جبر کے بت نے خدا ہونا ہے گر مان لیا
رکھا ٹھوکر پہ تو پھر خاک بہ سر ہونا ہے

دو قدم چل بھی نہیں پاتے ہیں ثاقب جو لوگ
ان کی قسمت میں ستاروں کا سفر ہونا ہے

منظور ثاقب

غزل

حیراں کر دیتا ہے اے رب تری قدرت کا مزاج
آگ کو ملتا ہے جب پھولوں کی خصلت کا مزاج

زندگانی کو بڑے چین سے جینا ہے مجھے
میں نے اپنایا ہے بس اس لئے خلوت کا مزاج

اس کے بن ایک بھی دن مجھ سے نہ کاٹا جائے
بن گیا یار واب ایسا مری چاہت کا مزاج

صرف ہونٹوں کو ہی کلیوں کے مشابہ نہ کہو
اس کی تخلیق میں ہی ضم ہے نزاکت کا مزاج

اور کسی میں تو نہیں حوروں میں مل سکتا ہے
جو مرے یار میں ملتا ہے نفاست کا مزاج

جب سے تعمیر سے تخریب در آئی اس میں
ہم کو اچھا نہیں لگتا ہے سیاست کا مزاج

مانگے بے مانگے سبھی طرح تو دیتا ہے رب
پھر بھی سمجھے نہیں ہم سب تری رحمت کا مزاج

یہ کسی حسنِ پری زاد کا احسان نہیں
مجھ کو رب نے ہے دیا پیار محبت کا مزاج

ویسے ہی پھول شرر بار طبیعت ہے لئے
جیسے ہے برف کی تاثیر میں حدت کا مزاج

آج ہر دل میں تری عظمتیں ہوتیں قائم
تو غضب کی جگہ رکھتا کہیں شفقت کا مزاج

ذکی طارق

غزل

کہیں جو چاک پہ ساگر کا دل بنایا گیا
ترا خیال وہیں متصل بنایا گیا

زمیں کا ثقل مجھے باندھنے سے قاصر تھا
سو تیرا خواب سرِ آب و گِل بنایا گیا

طلسمِ عشق کا ہے بھید آفرینش سے
تجھے حسین مجھے مضمحل بنایا گیا

وہ چاہتا تھا کچھ ایسا جو مضطرب ہی رہے
تو خاک چاک پہ رکھی یہ دل بنایا گیا

مجھے وصال کی خواہش بھی دائمی بخشی
ترے فراق کو بھی مستقل بنایا گیا

عجیب زخم ہے زخمِ شکست دل میرا
ہرا بھرا ہے مگر مندمل بنایا گیا

فقط مجھی کو میسر ہُوا وہ نشۂ غم
ترے فراق پہ جو مشتمل بنایا گیا

بچی جو خاک تجھے اپسرا بنانے میں
اُسی خمیر سے ساگر کا دل بنایا گیا

محمد سلیم ساگر

غزل

دل میں جو غم ہے اسے سب سے چھپانے کے لیے
یہ شبِ گریہ ہے رو کر مسکرانے کے لیے

آرزوئیں، خواہشیں، امیدیں ساری وصل کی
طاقِ جاں میں رکھ دی ہیں اک دن جلانے کے لیے

اس کی ہر اک بات کے ہوتے ہیں دو پہلو سدا
اک حقیقت کے لیے اور اک فسانے کے لیے

یہ مجھے معلوم ہے تیری کماں میں شام غم
تیر جتنے ہیں وہ ہیں مجھ پر نشانے کے لیے

اب تمنا کے فلک پر جگمگاتے ہیں بہت
میری امیدوں کے تارے ڈوب جانے کے لیے

ایسے ہی دل روتا ہے میرا تمہارے ہجر میں
جس طرح آنکھیں مری، آنسو بہانے کے لیے

پھر جلے افروز میرے دل میں الفت کے چراغ
پھر ہوائے غم چلی، ان کو بجھانے کے لیے

افروز رضوی

غزل

اَجل کو سینے لگائے ہوئے پرندے ہیں
تُمھاری چھت سے اُڑائے ہوئے پرندے ہیں

ہَمی کو جُھوٹی محبت کے خط لکھے تم نے
ہَمی تو کُو نہ بُلائے ہوئے پرندے ہیں

ہے بے وفائی ہی اِن کے ضمیر میں شامل
یہ کُوفیوں کے سُدھائے ہوئے پرندے ہیں

جلاؤ ، قید کرو یا ہمیں شہید کرو
نبیؐ کے شہر سے آئے ہوئے پرندے ہیں

جہاں میں اِن کو کہیں بھی سکوں نہیں ملتا
جو تیرے در سے اُٹھائے ہوئے پرندے ہیں

جو بُھس کا ڈھیر بنائیں گے ہاتھی والوں کو
خُدا نے پھر وہ بُلائے ہوئے پرندے ہیں

تمام جھیل کے مہماں ہیں، رُت بدلنے تک
جو برف زاروں سے آئے ہوئے پرندے ہیں

کہیں نہ اُڑنے لگیں، کتنا ڈر ہے بچوں کو
جو کاغذوں پہ بنائے ہوئے پرندے ہیں

مجھے یقین ہے سب کربلا سے آئے ہیں
جو خونِ دل میں نہائے ہوئے پرندے ہیں

پلٹ کے آئے ہیں شاید مزارِ غازی سے
جو اپنے بازو کٹائے ہوئے پرندے ہیں

انھی کے بچوں کی تیروں سے پیاس بجھتی ہے
علم جو حق کا اُٹھائے ہوئے پرندے ہیں

خُدا کا شکر یزیدی نہیں ، حُسینی ہیں
جو دینِ حق کو بچائے ہوئے پرندے ہیں

چراغِ خیمہ بجھایا ہے روشنی کے لیے
چراغِ دل جو جلائے ہوئے پرندے ہیں

عقیل شام غریباں کا ذکر سُنتے ہی
پروں سے خیمے بنائے ہوئے پرندے ہیں

عقیل رحمانی

غزل

یوں بے دلی سے حکم کی تعمیل کی گئی
عجلت میں میرے خواب کی تشکیل کی گئی

اُس نے کہا تو وصل کو تجسیم کر دیا
ہم نے کہا تو ہجر کی تکمیل کی گئی

مٹی سے پہلے میرا اٹھایا گیا خمیر
پھر اس میں اسمِ ذات کی ترسیل کی گئی

دم سادھ کر کھڑے تھے فرشتے بھی اس گھڑی
جب میرے جسم و جان کی تشکیل کی گئی

اس بار اُس نے تیر بھی بدلا کمان میں
اس بار میری سمت بھی تبدیل کی گئی

پہلے تو عشق زاد کو رسوا کیا گیا
پھر حُسن کے خداؤں کی تذلیل کی گئی

دشتِ طلب میں دھوپ اگانے سے پیشتر
شاہد سرائے خواب کی تشکیل کی گئی

افتخار شاہد

غزل

اِک سے بڑھ کر ایک ہے سلطان، تیرے شہر میں
صرف میں ہوں بے سروسامان، تیرے شہر میں

دیکھتا ہوں جس طرف حیوان ہی حیوان ہیں
رو رہے ہیں کس طرح انسان، تیرے شہر میں

لے چلا ہوں ساتھ اپنی روح کی تنہائیاں
رکھ دیئے ہیں میں نے جسم و جان، تیرے شہر میں

غیر ہوں، نا آشنا ہوں، اجنبی ہوں، آج بھی
کچھ نہیں انصر مری پہچان، تیرے شہر میں

سینت کے رکھا ہوا تھا ایک مدت سے مگر
ہو گیا غارت مرا ایمان، تیرے شہر میں

زندگی کی تلخیوں نے چھین لی ہے زندگی
مر گیا ہوں میں تو میری جان، تیرے شہر میں

پوچھتا ہوں دوستوں سے میں طبیبوں کے پتے
ڈھونڈتا ہوں درد کا درمان، تیرے شہر میں

صرف تُو ہے، صرف تُو ہے، صرف تُو ہے دوستا!
اور کوئی بھی نہیں پردھان، تیرے شہر میں

کیا بتاؤں، کیا بتاؤں، کیا بتاؤں، ساتھیا!
ہو گیا ہے جو مرا نقصان، تیرے شہر میں

انصر حسن

غزل

ہر سُو غموں کا راج ہے میں نے کہا نہ تھا
بے درد یہ سماج ہے میں نے کہا نہ تھا

اَب دردِ دل کی ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں دوا
یہ عشق لا علاج ہے میں نے کہا نہ تھا

سادہ دلوں کو لُوٹنا ہے اِس کا مشغلہ
یہ حُسن کا مزاج ہے میں نے کہا نہ تھا

قدریں بدل رہی ہیں نگارِ حیات کی
پیارا بہو سے داج ہے میں نے کہا نہ تھا

سُولی پہ مسکراتے ہیں دیوانگانِ عشق
اِن میں یہی رواج ہے میں نے کہا نہ تھا

کرتی نہیں وفا کبھی صورت کی دلکشی
سیرت ہی سَر کا تاج ہے میں نے کہا نہ تھا

دل دے دیا تو اَب سحر اِس کا صِلہ نہ مانگ
دِل حُسن کا خراج ہے میں نے کہا نہ تھا

اکرم سحر فارانی

غزل

جو کل ملا تھا یونہی زندگی کی راہوں میں
وہ آج بسنے لگا ہے مری نگاہوں میں

سمجھ نہ ایسا بھی مجھ کو نا عاقبت اندیش
پڑا ہوں سوچ سمجھ کر ہی کچھ گناہوں میں

میں ریزہ ریزہ وہی اعتبار چنتا ہوں
جو کل تلک تھا بہت معتبر نگاہوں میں

ہمارے سوچ اُجالے نہ رک سکے پھر بھی
بہت ہجوم تھا گو ظلمتوں کی راہوں میں

میں کیسے بیچ دوں خودداریوں کے وہ اعزاز
کہ جن کے دم سے میں شامل ہوں کجکلاہوں میں

بچھڑ گئی ہیں دعائیں مری تاثر سے
کہاں سے لاؤں میں تاثیر اپنی آہوں میں

میں منزلوں کی ہوس سے تہی نہیں ہوں جلیل
الجھ گیا ہوں ذرا راستوں کی بانہوں میں

احمد جلیل

غزل

خواہشوں کا غلام آدمی ہوں
خاص کب ہوں میں عام آدمی ہوں

مجھ میں شیطان بھی ہے تھوڑا بہت
اور باقی تمام آدمی ہوں

دام چوگرد گیسوؤں کے ہیں
اور میں زیرِ دام آدمی ہوں

ہوں محبت میں جنگ کا قائل
بر سرِ انتقام آدمی ہوں

مجھ پہ الزامِ بت پرستی ہے
حسن سے شاد کام آدمی ہوں

میں کہ مسجود ہوں ملائک کا
قابلِ احترام آدمی ہوں

رانا سعید دوشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تمام عمر بس اک رت جگے میں بیت گئی
تمام عمر ہم اک مہرباں کے ساتھ رہے

غزل

کوئی دیوار بلاتی ہے نہ در کھینچتا ہے
تجھ سے جب دور میں ہوتا ہوں تو گھر کھینچتا ہے

جب سمندر میں اترتا ہوں میں لہروں کے خلاف
جانے کیوں اپنی طرف مجھ کو بھنور کھینچتا ہے

میں بھی سرسبز نظر آتا ہوں اس دنیا کو
اپنی جانب مجھے گل رنگ شجر کھینچتا ہے

نفرتیں آیا ہوں دریا کے حوالے کر کے
ہر گھڑی اس کی محبت کا اثر کھینچتا ہے

دکھ کے منظر مری پلکوں پہ ٹھہر جاتے ہیں
چاندنی رات میں کیا دیدۂ تر کھینچتا ہے

گردشِ وقت سے باہر میں نکلتا ہی نہیں
کون برسوں سے مجھے شام و سحر کھینچتا ہے

کس کے لکھنے سے بدل جاتی ہے قسمت سب کی
کون کاغذ پہ قلم رکھ کے خبر کھینچتا ہے

دل میں صیاد کے بھی گوشۂ احساس نہیں
زخم دے دے کے پرندوں کے وہ پر کھینچتا ہے

کیا کہوں کوزہ گری کس نے سکھائی ہے نوید
مجھ کو مٹی کی طرف میرا ہنر کھینچتا ہے

محمد نوید مرزا

غزل

تجھ کو سوچوں تو رنگِ در کھل جائیں
جس طرح مورنی کے پر کھل جائیں

اس کی خوشبو سے مہکے میرا چمن
راستے اس کو دیکھ کر کھل جائیں

طور سے ایک ہاتھ دور ہوں میں!
جلوہ و حسن آنکھ بھر کھل جائیں

جانے کیا کیا ہو تیرے جانے سے
کتنے وہم و گماں میں ڈر کھل جائیں

آسماں بن گیا مرا بازو
اور اب کتنا بے خبر کھل جائیں

منہ نہ موڑیں گے کافر و مومن
باغِ جنت کے جب ثمر کھل جائیں

دل سے اٹھ جائے ایک اک دربان
اور ہم پر یہ بحر و بر کھل جائیں

رخشندہ نوید

غزل

پریشانی کہاں تک جا سکے گی
یہ دیوانی کہاں تک جا سکے گی

سفر ایجاد کر کے دیکھتے ہیں
نگہبانی کہاں تک جا سکے گی

ہمیں مشکل ہے اپنے ساتھ چلنا
تو آسانی کہاں تک جا سکے گی

صدائے نغمۂ ارژنگِ فانی
میاں مانی! کہاں تک جا سکے گی

سفر برباد! کہہ کے بھیجتے ہو
یہ مرجانی کہاں تک جا سکے گی

فرح رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

غزل

خواہشوں اور اُلجھنوں کا کارواں ہے زندگی
ہر قدم پر اِک نیا ہی امتحاں ہے زندگی

کون پڑھ سکتا ہے اس کو مختصر سی عُمر میں
داستاں در داستاں در داستاں ہے زندگی

دربدر پھرتی ہے جانے کیوں کبھی رُکتی نہیں
کھوج میں کس بے وفا کی سرگراں ہے زندگی

بخت دوری کا سبب تھا کل ہمارے درمیاں
آج کیسا وقت آیا درمیاں ہے زندگی

ایک دُوجے کے غموں کو پھر سمجھتے کس طرح
تُم کہاں ہو میں کہاں ہوں اور کہاں ہے زندگی

متفق ہیں اس حقیقت پر جہاں والے سبھی
مہرباں ہے موت اور نامہرباں ہے زندگی

میں تقاضے اس کے سارے تو نبھا سکتا نہیں
کس لیے جانے یہ شاہد بدگماں ہے زندگی

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

چھپ کے گوشے میں گھر کے پڑے ہیں سبھی، جیتے جی اب نہیں ہے یہاں زندگی، کیا سبھی لوگ بے وقت مر جائیں گے
سوز، نم، نالہ، فریاد، آہ و فغاں، صرف گریہ و شیون، نہیں پی کہاں، ذرے ذرے چمن کے بکھر جائیں گے

وصل، قربت، تکلف، تبسم، بھرم، گفتگو، ناز، انداز، شوخی، ہم، رنگ، خوشبو کا، سانسوں کا یہ زیر و بم
ہجر و فرقت، جدائی کے سب ہیں امیں، ایک برزخ، خلاء، آسمان و زمیں، جانے یہ سب کے سب اب کدھر جائیں گے

فخر، نخوت، شرف، جاہ، حشمت، نسب، خان، سردار، سید کے، سر کے لقب، آ گئے خوف کی ہیں پناہوں میں سب
بستیاں، شہر، اوطاق، چوبارے، گھر، صحن، دالان، خلوت، ہر اک بام و در، اتنے سونے ہوئے لوگ ڈر جائیں گے

جام، مینا، سبو، ساقی، خندہ لب، میکدے، مے کشی کے نرالے وہ ڈھب، زندگی کے وہ رنگین سب روز و شب
دم بخود ہیں کہ آخر یہ کیا ہو گیا، مرنے، جینے کا سارا مزا کھو گیا، جانے یہ سب کے سب کس نگر جائیں گے

یاسمیں، زرد، کچنار، سوسن، شقیق، پھول، کلیاں، کنول، موتیا، نازبو، گیندے، نرگس، گلابوں کے سارے رفیق
خار و خس بن کے ہر سو بکھر جائیں گے، دشت، جنگل، جبل، بھک سے اڑ جائیں گے، بے بسی تیرے قصے سنو جائیں گے

حور، غلماں، ملائک، یہ جن و بشر، مور، قمری، پپیہا، مرا نامہ بر، شاخِ گل، یہ ثمر بار برگ و شجر
اک نگاہِ کرم ہم پہ مولا کریم، مانگتا ہے دعا تیرا ابن عظیم، چھوڑ کر نہ کہیں تیرا در جائیں گے

ابن عظیم فاطمی

غزل

نہ چار سُو ہیں، نہ ہی شش جہات میرے لیے
ہے کائنات عدم کائنات میرے لیے

میں تا کہ ڈھونڈتا رہ جاؤں اپنے امکانات
بنایا عالمِ ناممکنات میرے لیے

کسے خبر تھی کہ پہلو میں بیٹھنے والے
کھڑی کریں گے کئی مشکلات میرے لیے

گھٹن بھی دُور کرے گا وہ میری ظلمت بھی
گھٹائیں بھیجے گا بجلی کے ہاتھ میرے لیے

ہمیشہ رکھتی ہے سیراب دل فریبی تری
سراب ہو گیا آبِ حیات میرے لیے

سبب کی لہر اُدھر ارتعاش گیر ہوئی
اِدھر اُبھرنے لگے واقعات میرے لیے

بس اک صراط ہے جو مستقیم ہے مجھ میں
بس اک سبیل ہے راہِ نجات میرے لیے

نواح و گرد کی دُنیا نہ کُھل سکی مجھ پر
ادق ہے اپنی ہی ماحولیات میرے لیے

میں اِن کو جوڑ کے جھرمٹ کوئی بنا لوں گا
بہت ہیں رَوشنی کی باقیات میرے لیے

جُڑی ہے روح کے سیّارچے سے موج مری
بحال کیوں نہ رہیں نشریات میرے لیے

میں کائناتی سفر میں اکائی تک پہنچا
فزکس ہو گئی رُوحانیات میرے لیے

نئے جہانوں میں لے جاتے ہیں مجھے شاہد
یہ گیارہ شعر ہیں گیارہ جہات میرے لیے

شاہد ماکلی

غزل

چلن ، دنیا کا کیسا ہو رہا ہے؟
محبت میں بھی دھوکا ہو رہا ہے

ہوائے وقت کو چلنے سے روکو
چراغ عمر، ٹھنڈا ہو رہا ہے

فسوں سازی جہاں کی دیکھیے گا
نیا ہر پل ، تماشا ہو رہا ہے

کوئی سایہ ، رہ الفت پہ ہے کیا؟
بہت دشوار ، رستہ ہو رہا ہے

جو اچھا تھا ، برا ہونے لگا وہ
برا تھا جو ، وہ اچھا ہو رہا ہے

امیری میں فقیری کا مسلسل
زمانے میں دکھاوا ہو رہا ہے

خرد جس کو سمجھنے سے ہے قاصر
مرے آگے یہ کیا کیا ہو رہا ہے

وفا کی رسم کیا اٹھی جہاں سے
جو اپنا تھا ، پرایا ہو رہا ہے

سنا ہے محفلِ خوباں میں شوکت
ترے شعروں کا چرچا ہو رہا ہے

شوکت محمود شوکت

غزلیں

اک چاند ستاروں کی زنجیر میں دیکھا ہے
یہ خواب بھی خوابوں کی تعبیر میں دیکھا ہے

جلتی ہوں جہاں شمعیں آ جاتے ہیں پروانے
اتنا تو محبت کی تاثیر میں دیکھا ہے

در پردہ خلاف اس کے احوال نظر آئے
جس طور کا واعظ کو تقریر میں دیکھا ہے

دیکھا ہے تجھے ہم نے، گو تجھ کو نہیں دیکھا
اک نقش ترا تیری تحریر میں دیکھا ہے

ہو طرزِ سخن ایسا ہر شخص پکار اٹھے
اک چہرہ ہے جو میں نے تصویر میں دیکھا ہے

جس طرح مکاں کوئی محرومِ مکاں روشن
اک گھونسلا کمرے کے شہتیر میں دیکھا ہے

اعجاز روشن

دل سے اب غم کا بھی احساس مٹا ڈالا ہے
جو دیا طاق میں روشن تھا بُجھا ڈالا ہے

کھول دی ساری حقیقت سرِ خلقت اپنی
اپنے چہرے پہ جو پردہ تھا ہٹا ڈالا ہے

اور پیرایۂ رسوائی بھی کیا ہونا تھا
اک تماشا سرِ بازار دکھا ڈالا ہے

دے گیا داغِ جدائی کوئی جانے والا
ہائے کمبخت نے کیا دل میں خلا ڈالا ہے

دل میں کب درد محبت تھا یہ گاہے گاہے
سر اٹھاتا تھا جو شعلہ وہ دبا ڈالا ہے

غزل

رنگِ احساس جب آنکھوں کو نظر آنے لگا
جھولیاں بھرنا ، دعاؤں کو نظر آنے لگا

کیا مسیحائی تھی اس لمس کی خوشبو میں نہاں
راستہ ، راستہ اندھوں کو نظر آنے لگا

کتنے ہی سائے اندھیرے میں چھپے بیٹھے تھے
آگ لگتے ہی چراغوں کو نظر آنے لگا

ایک آواز نے توڑا تھا کبھی سناٹا!
اور انسان زمانوں کو نظر آنے لگا

پھیلتے شہر کی توسیع و ترقی میں کہیں
اپنا انجام درختوں کو نظر آنے لگا

میرے اللہ ترا شکر کہ مجھ ایسا بھی
تیرے احسان سے یاروں کو نظر آنے لگا

ایک دیوار کے گرتے ہی اٹھی اک امید
ایک دروازہ خیالوں کو نظر آنے لگا

حوصلہ اور بڑھا ذوقِ شناسائی کا
باب تکمیل ارادوں کو نظر آنے لگا

بات کیا کر لی کبھی ہنس کے کسی سے آکاش
سلسلہ اور ہی لوگوں کو نظر آنے لگا

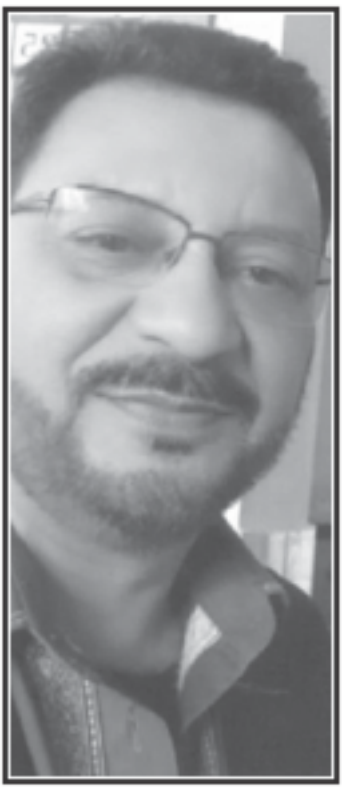

احمد سبحانی آکاش

غزل

کس طرح سے ٹپکیں گے آنسوؤں پہ اب آنسو
ہم نے اپنے حصے کے رو دیے ہیں سب آنسو

کچھ نہ کچھ تو ٹوٹا ہے دل کی خستہ بستی میں
آنکھ سے نہیں بہتے یونہی بے سبب آنسو

آنسوؤں کی اپنی ہی اک الگ سی دنیا ہے
جب زبان ساقط ہو بولتے ہیں تب آنسو

بات تھی کوئی ایسی جس پہ مل کے روئے تھے
بس ہمارے ملنے کا بن گئے سبب آنسو

غم کی آتشی لے کو قہقہوں میں بُنتے ہیں
کھیل کھیل دیتے ہیں کیا عجب عجب آنسو

دیکھ کس قرینے سے دل میں پال رکھے ہیں
کرب، خامشی، الجھن، غم، فراق، شب، آنسو

بھر گیا تھا جھرنوں کا شور سارے کمرے میں
اس طرح بہائے تھے ہم نے روز و شب آنسو

اب دعائیں کیا مانگیں ہاتھ کس طرح اٹھیں
ہم تو یہ سمجھتے تھے مانتا ہے رب آنسو

عرفان صادق

غزل

محاذِ جنگ پہ آئے تمام صُلح پسند
سو مُشکلوں میں گھرے ہیں عوام صلح پسند

بنا دیا ہے جہنم ہرا بھرا رستہ
لہو اُچھالتے ہیں صبح و شام صُلح پسند

جسے عزیز رہی ہو گی فاختائے امن
چُکا سکیں گے کہاں اُس کے دام صُلح پسند

گلے لگا کے حریفوں کو مُسکرائیں گے
جہاں میں اپنا بنائیں گے نام صُلح پسند

ہر اک دیار میں پہنچے حیاتِ امن و سکوں
یہی دُعا ہے کہ پائیں دوام صُلح پسند

کبھی نہ جنگ کے بادل فضا میں لہرائیں
ضرور ایسا کریں اہتمام صُلح پسند

وہ اِس زمیں میں اُگاتے ہیں امن کے پودے
یقیں ہے، پائیں گے اعلیٰ مقام صُلح پسند

سلام پیش کیا جائے اِن کی عظمت کو
بہت ہیں واجبِ صد احترام صُلح پسند

جو آفتاب کے جلوؤں سے جلنے والے ہیں
کریں گے اپنی ہی نیندیں حرام صُلح پسند

آفتاب خان

غزل

خود کو دلدل میں اتارا نہیں جاتا مجھ سے
شامِ غم تجھ کو پکارا نہیں جاتا مجھ سے

اب جو الجھا ہے وہ رشتہ میں سنواروں کیسے
گھر کا آنگن تو سنوارا نہیں جاتا مجھ سے

روح تک چیر کے رکھ دیتی ہیں نظریں اس کی
روز یوں خود کو تو مارا نہیں جاتا مجھ سے

سب کو کیوں لگتا ہے یہ میرا حوالہ تُو ہے
تیرے ہاتھوں سے یوں ہارا نہیں جاتا مجھ سے

ہجر میں کیسے کٹے گی یہ مری عمر بھلا
ہائے اک پل تو گزارا نہیں جاتا مجھ سے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں گراں گراں رہیں نیندیں دھواں دھواں
وہ دھند کی طرح مرے خوابوں پہ چھا گئی

غزل

نہیں آج کل یہ مجھے خبر کہ میں ایک ہوں کہ ہزار ہوں
کبھی چل رہی ہوں زمین پر، کبھی آسماں پہ سوار ہوں

جو خزاں سے بڑھ کے خزاں لگے، میں یہ کیسی فصلِ بہار ہوں
جو تری ہوا میں بکھر گیا، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں اگرچہ تیری امان ہوں، میں اگرچہ تیرا حصار ہوں
ترے دشمنوں میں شمار تھی، ترے دشمنوں میں شمار ہوں

وہی خواہشیں ہیں نصیب در ترے آستاں پہ جو مر گئیں
جو پہنچ کے در سے پلٹ گئی، وہی چیخ ہوں، وہ پکار ہوں

مجھے ورثے میں جو ملا تھا غم، وہ تو کچھ نہیں ہے تری قسم
ترے ہجر نے جو عطا کیے اُنھی آنسوؤں کی قطار ہوں

مٹی روشنی کہاں زندگی، ابھی دل میں ان کی جگہ نہیں
مرے دل میں دفن ہیں حسرتیں میں تو آپ اپنا مزار ہوں

اے خدا جو بخشی ہیں نعمتیں، یہ جو رحمتیں، یہ جو برکتیں
میں ہمیشہ شکر گزار تھی، میں ہمیشہ سجدہ گزار ہوں

خالدہ انور

غزل

گر سب اچھا ہونا ہوتا تو اچھا سب ہوسکتا تھا
جس نے بگڑنا تھا وہ بگڑا، وہ اچھا کب ہوسکتا تھا

چارہ گروں کی چارہ گری نے آخر اس کو مار دیا
جس نے اچھا ہو جانا تھا وہ اچھا جب ہوسکتا تھا

نظمِ جہاں پر سوچنے والے جانے کب سے سوچ رہے تھے
لگتا نہیں تھا کارِ جہاں بھی اتنا بے ڈھب ہوسکتا تھا

وقت کی نبض پہ ہاتھ جو ہوتا تو حالات بدل سکتے تھے
یہ اس وقت کی بات تھی لیکن یہ تو بس تب ہوسکتا تھا

توبہ کی جو مہلت ملتی تو توبہ بھی ہو سکتی تھی
وقت پہ توبہ جو کر لیتے تو راضی رب ہوسکتا تھا

جانے کیسے آتے جاتے، آمنا سامنا ہو جاتا تھا
اتنی گہری چاہت کا یہ ایک سبب ہو سکتا تھا

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

قدم سیدھا بھی ٹیڑھا پڑ رہا ہے
کہ رستے میں بھی رستہ پڑ رہا ہے

جہاں پر دھوپ تھی درکار ہم کو
وہاں مدت سے سایا پڑ رہا ہے

کہانی کے تقاضے کے مطابق
مجھے کچھ جلدی مرنا پڑ رہا ہے

محبت کو جواں رکھنے کی خاطر
ہمیں آپس میں لڑنا پڑ رہا ہے

گوارا کیوں نہیں یک طرفہ الفت
تمہیں کیا اس کا خرچہ پڑ رہا ہے

انہیں آنسو چھپانے کا ہنر ہے
وہ جن آنکھوں میں تنکا پڑ رہا ہے

تعاقب میں عدو آئے تو آئے
ہمیں دریا میں رستہ پڑ رہا ہے

افتخار شوکت

غزل

وہی رات بھر تجھے سوچنا وہی چاہتوں کے نصاب ہیں
یہ بڑے طویل ہیں سلسلے یہ بڑے طویل عذاب ہیں

ہمیں روز ملتی ہیں سازشیں یہاں دوستی کے لباس میں
یہاں ہر قدم پہ فریب ہیں یہاں ہر قدم پہ سراب ہیں

یہ کرم ہے ربِ کریم کا مجھے اتنے رنگ عطا کیے
جو مٹا رہے تھے نشاں مرا نہ سوال ہیں نہ جواب ہیں

جو سمندروں میں سکوت ہے اُسے دیکھ کر نہ فریب کھا
کئی اشک ہیں جو بپے نہیں کئی زلزلے تہہ آب ہیں

کئی چاندنی میں گندھے ہوئے کئی تتلیوں میں گھرے ہوئے
وہ جو پھول تھے تری راہ کے وہی آج مجھ پہ عذاب ہیں

وہ جو لوگ تھے یہاں ریت سے انہیں کیا ہوا وہ کہاں گئے
یہاں پتھروں سی ہے بے حسی یہاں پتھروں سے گلاب ہیں

ہمیں بھوک اپنی قبول ہے یہاں نفرتیں نہیں بیچتا
مرے گاؤں میں بڑا امن ہے مری آنکھ میں بڑے خواب ہیں

اظہر کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

غزل

اک ایک شاہ پہ گزری ہر ایک شاہ کے بعد
پناہ ڈھونڈو گے تم دیکھنا پناہ کے بعد

تو لوٹ آیا ہے تو شکریہ مگر اے دوست
دل اور لاؤں کہاں سے دل تباہ کے بعد

ہر ایک جبر کے انجام کی خبر ہے ہمیں
کہ صبح ہوتی ہے آخر شبِ سیاہ کے بعد

وہ اک گناہ مری زندگی کا حاصل ہے
طریقِ بندگی پایا ہے جس گناہ کے بعد

بس اک نظر سے خدا پر مجھے یقیں آیا
نگاہ پھر نہ اٹھائی اس اک نگاہ کے بعد

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا ، تجھ پہ کُھلا ، یا ، نہ کُھلا میں

غزل

سفر میں ساتھ ہو کر بھی شریکِ غم نہیں ہوتا
یہی اک غم ہے جیون میں کہ صدمہ کم نہیں ہوتا

ہمیں کیا غم تھا ہنس ہنس کر پیالہ ہم بھی پی لیتے
ترے ہاتھوں سے گر ملتا تو اتنا غم نہیں ہوتا

ابھی وہ عشق کیا جانے ابھی وہ لطف کیا پائے
میسر جس کے دل کو بھی نشاطِ غم نہیں ہوتا

تبھی تو دربدر ہوکر اسی ظالم پہ مرتے ہیں
یہ کیفِ عشق ہے لوگو کبھی جو کم نہیں ہوتا

یہ دنیا کیسی بستی ہے جہاں آنسو ہی آنسو ہیں
نہیں دیکھا کوئی ایسا جسے کچھ غم نہیں ہوتا

اویس اپنی ریاضت سے بنالیں گے انھیں اپنا
وہ کیا جانیں جو یہ جانیں کہ پتھر نم نہیں ہوتا

اویس الحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزلیں

تمام عمر یہی ایک کاروبار کیا
کہیں پہ نقد لیا دل کہیں ادھار کیا

سلوک و جذب کے عالم میں بارہا ہم نے
گرے ہوؤں کو اٹھایا تو شہسوار کیا

قبول ورد سے نکل کر تلاشِ منزل میں
جو دل نے چاہا وہی رستہ اختیار کیا

تمہارے بعد ستاروں کی چھاؤں میں ہم نے
اکیلے بیٹھ کے خود اپنا انتظار کیا

یہ مت کہو کہ ہمیں عشق اپنے آپ سے ہے
یہاں تو جو بھی ملا اس پہ اعتبار کیا

طواف کرتا رہا خود سپردگی کے ساتھ
وہ ایک شخص کہ غیروں میں ہی شمار کیا

ہمارے ہاتھ سلگتے بدن پہ پھرنے لگے
ہماری سانس نے رگ رگ کو بے قرار کیا

کسی کے عارض ولب پر بکھیر دی سرخی
خزاں کا درد سہا اور اسے بہار کیا

ادھیڑ عمر شرارت سے کھل اٹھا تھا وجود
شب وصال نیا رنگ آشکار کیا

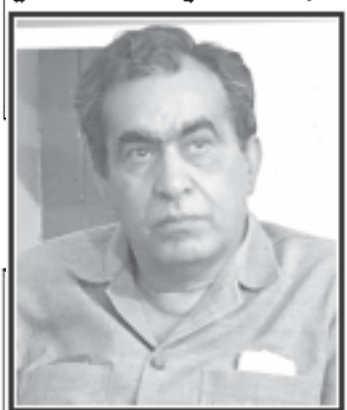

اورنگزیب حسام حر

دھواں اٹھا تھا جہاں سے وہاں پہ آگ لگی
مگر یہ بات ڈرامے کا ڈائیلاگ لگی

انہیں تو سچ بھی ہمارا فسانہ ساز لگا
انہیں تو چپ بھی ہماری انا کا راگ لگی

عدو کو ایک نظر دیکھ کر بھی سوئے رہے
یہ آنکھ نیند میں کھوئی تو پھر نہ جاگ لگی

بدن ملن کی تپش سے لگا تھا بل کھانے
ہوئی وہ آنکھ نشیلی تو زلف ناگ لگی

یہ اور بات پسند آ گیا تھا اور کوئی
وگرنہ دل کو نہ بھائی کبھی وہ بھاگ لگی

یہی ہے سچ کہ ہمیں دیر تک طلب نہ رہی
کبھی تھا جان سے پیارا وہ جس سے لاگ لگی

بس ایک عہد کیا تھا جسے نبھانا تھا
بلا سے زین تھی رہوار پہ نہ باگ لگی

غزل

تُو چھوڑ کر گیا ہے تو کیا ہار مان لوں
یہ عشق نارسا ہے تو کیا ہار مان لوں

بگڑے ہیں سارے کام تو ہے چشمِ بد کوئی
دشمن کی بد دعا ہے تو کیا ہار مان لوں

اظہار پہ ہیں قدغنیں، ہے آمروں کا دور
اک جبرِ ناروا ہے تو کیا ہار مان لوں

مجھ کو نہیں ہے موت کی وادی کا کوئی خوف
پھیلی ہوئی دبا ہے تو کیا ہار مان لوں

رستے پہ اُس کو دیکھنا میں لے ہی آؤں گا
مانا وہ بے وفا ہے تو کیا ہار مان لوں

جبران وہ تو اب مجھے پہچانتا نہیں
اُس نے بھلا دیا ہے تو کیا ہار مان لوں

وسیم جبران

غزل

جس کے میں انتظار میں بیٹھا
تھا وہ پہلوئے یار میں بیٹھا

موت کی یاد آ گئی ہو گی
جا کے وہ جو مزار میں بیٹھا

چاند چمکے ہے جیسے تاروں میں
یار چمکے ہزار میں بیٹھا

اُس کے آنے کی مل گئی تھی خبر
اِس لیے رہ گزار میں بیٹھا

صحنِ جاناں میں آ گیا تو لگا
بعد مدّت بہار میں بیٹھا

مسندِ عشق پر میں بیٹھا ہوں
حُسن کے وہ دیار میں بیٹھا

اُس کو نفرت نے مضطرب رکھا
پُرسکوں تھا میں پیار میں بیٹھا

کل تکبر تھا جس کو مسند پر
آج وہ ہے غبار میں بیٹھا

حُسن پر ناز تھا ندیم اُسے
''میں تھا اپنے خمار میں بیٹھا''

ریاض ندیم نیازی

غزل

اصغر علی بلوچ

جلائے رکھتے ہیں جو لوگ رفتگاں کے چراغ
وہ ہیں زمیں کے ستارے وہ آسماں کے چراغ

یہ اور بات کہ کردار مرتے رہتے ہیں
مگر ہمیشہ فروزاں ہیں داستاں کے چراغ

عجب طلسم کی دنیا میں لے کے جاتے ہیں
یہ خانقاہ کے جگنو یہ آستاں کے چراغ

کبھی مزار، کبھی بام و در کی زینت ہیں
شبِ سیاہ کے رخ پر گزشتگاں کے چراغ

فلک نژاد ستارے ہیں یا زمیں کے پھول
روش پہ اس کے قدم ہیں یا کہکشاں کے چراغ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ بھی کہنے کو نہ مانگا خالد!
بات کہنے کو ہنر مانگ لیا

غزل

تیرے دل میں اگر نہیں رہتے
اس طرح ہم سفر نہیں رہتے

بات والوں کی بات رہتی ہے
بات والوں کے سر نہیں رہتے

باز آئیں نہ جو بغاوت سے
ان پرندوں کے پَر نہیں رہتے

رزق ہو ، عشق ہو کہ کارِ سخن
جن کو سودا ہو گھر نہیں رہتے

دل سے جو ایک در کے ہوتے ہیں
وہ کبھی در بہ در نہیں رہتے

ہاتھ آتے ہی مسندِ مطلوب
آپ کیوں معتبر نہیں رہتے

چل تو پڑتے ہیں بیش تر نازش
اور پھر بیش تر نہیں رہتے

شبیر نازش

غزلیں

جان دے کر بھی مجھے کوئی خسارا تو نہیں
میں ابھی اپنی بقا کی جنگ ہارا تو نہیں

تا ابد جاری رہے گا روشنی کا یہ سفر
آخری میں ڈوبنے والا ستارا تو نہیں

ہم اسی ذاتِ خدا کی بندگی کرتے رہے
دار پر بھی غیر کو ہم نے پکارا تو نہیں

بیٹھ کر تنہا ذرا سوچیں خدائے پاک نے
آدمی کو خاک پر یونہی اتارا تو نہیں

ایک قطرے میں بھی بحرِ بے کراں ہے زندگی
اس سمندر کا سکندر حد کنارہ تو نہیں

مرزا سکندر بیگ

آخری آسمان سے آگے
کون ہے لامکان سے آگے

اور بھی کائنات ہے کوئی
آدمی کے گمان سے آگے

اک خلا ہے خلا کے اندر بھی
اک جہاں ہے جہان سے آگے

لوٹ کر پھر کبھی نہیں آتا
جو گیا اُس نشان سے آگے

آخری ہے سفر چٹانوں کا
کچھ نیا ہے ڈھلان سے آگے

یاد کچھ بھی نہیں سکندر بیگ
جو ہوا داستان سے آگے

غزل

سادات اس زمیں کو نسلوں سے جانتے ہیں
موجود گان تو بس نقشوں سے جانتے ہیں

بیمار روح کی کب تشخیص کر سکیں گے
تن کا علاج جو بس، نبضوں سے جانتے ہیں

ہم سرخ برف زاروں کے وہ شکستہ جن کو
سب، اُن پہ ہونے والے قبضوں سے جانتے ہیں

انبار! تیرے دعوے داروں سے پوچھنا ہے
اس رش میں کتنے تجھ کو ذروں سے جانتے ہیں

یوں پر تپاک ملتے ہیں راستوں کے کانٹے
جیسے وہ پیروں کو، سو برسوں سے جانتے ہیں

الجھن میں مبتلا رہنے والے اہلِ محفل
اک غیر حاضری کو عرصوں سے جانتے ہیں

چھوڑو یہ خبریں پڑھنا، آؤ کسان کا دکھ
خود جا کے چند اجڑی فصلوں سے جانتے ہیں

ان کی سیہ شبی سے واقف نہیں پرندے
وہ ان پہاڑیوں کو سبزوں سے جانتے ہیں

ساگر حضور پوری الحمد پڑھ لیا کر
دو چار لوگ تجھ کو شعروں سے جانتے ہیں

ساگر حضور پوری

غزل

سکونِ دل کا کچھ سامان رکھنا
خیالِ یار کو مہمان رکھنا

حقیقت میں سراپا خاکساری
بظاہر خود کو عالی شان رکھنا

جہاں کون و مکاں ہی رفتنی ہوں
وہاں کیا خواہش و ارمان رکھنا

معارف کے خزانے چھان کر بھی
تشخص سربسر نادان رکھنا

کبھی ہمزاد اپنا عکس کرنا
کبھی آئینے کو حیران رکھنا

دُعائے مادرِ مشفق کی چادر
ہمیشہ اپنے سر پر تان رکھنا

سُنا ہے حشر میں انصاف ہوگا
وہاں پر بے نوا کا مان رکھنا

دُوئی کے شرک کی آلودگی سے
بہشتِ معرفت ، ویران رکھنا

سفر کر کے بھی اسفل کھائیوں کا
لقب ہر حال میں انسان رکھنا

نظر میں زاویۂ ارض و سما کے
بغل میں شعر کا دیوان رکھنا

کلامِ خالد احمد نے سکھایا
سخن میں نو بہ نو امکان رکھنا

جہاں پر چھوڑ جائے ساتھ ، سایہ
وہاں بھی حوصلہ فیضانؔ رکھنا

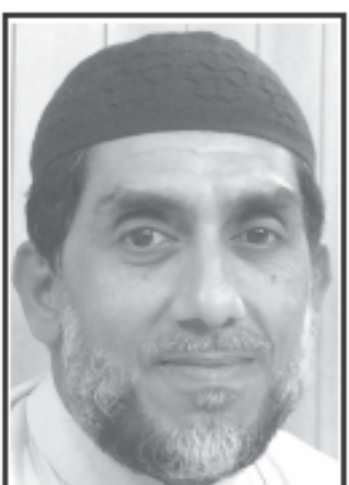

فیض رسول فیضان

غزلیں

دولتِ شوق دکھا، روحِ سخاوت سے ملا
دل میں جو رہتا ہے اس پیکرِ الفت سے ملا

پاؤں زخمی ہیں تو کیا، دامن صد چاک کو چھوڑ
حوصلہ توڑ کے مت مجھ کو ہزیمت سے ملا

تیرے آڑے نہ کبھی آئے گی منشا میری
مجھ کو دریا میں بہا، کوہ کی رفعت سے ملا

بے سبب تو نہیں یہ اشک فشانی اے دل!
سلسلے درد کے ماضی کی مسافت سے ملا

خالی لفظوں سے سروکار نہیں دنیا کو
جاذب افسانے کا انجام حقیقت سے ملا

اکرم جاذب

کچھ خیر خبر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
دیوار میں در رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
ارزاں نہ ہمیں کر دے فراوانی ہماری
کچھ قدرِ گہر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
آساں نہ رہے عشق کی راہوں کا سفر جب
یہ پیشِ نظر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
خوش فہمیاں جینے کی اگر راہ دکھائیں
دل شام و سحر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
طے ہے کہ محبت کے نگر جانا نہیں ہے
کچھ عزمِ سفر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!

تھک ہار کے دنیا کے جھمیلوں سے کسی شام
آغوش میں سر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
محسوس ہو جب رابطہ رکھنے کی ضرورت
بے خوف و خطر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!
وارفتگی کے دن تو ہوا ہو گئے جاذب
ہمراہ مگر رکھے گا ہم دوست تو ہیں نا!

غزل

ریت بنتے ہیں سمٹتے ہیں بکھر جاتے ہیں
جب ترے شہر سے ہم دیدۂ تر جاتے ہیں

ہم ہیں بازار میں پھرتی ہوئی زندہ لاشیں
اپنے قدموں پہ دھرے رختِ سفر جاتے ہیں

زندگی جینے کا تاوان لیا کرتی ہے
روز ہم جیتے ہیں اور روز ہی مَر جاتے ہیں

رزق ملتا ہے یہاں نانِ تبرک کی طرح
جن کی لاٹھی ہو وہی لے کے ثمر جاتے ہیں

بِل نہیں ہیں یہ سبھی موت کے پروانے ہیں
لوگ اعداد کے زندان میں مَر جاتے ہیں

ہم کو معلوم ہے قیمت بھی شناسائی کی
دل کی پھر مانتے ہیں بارِ دگر جاتے ہیں

یوں ہیں فیصل پسِ دروازۂ غم سہمے ہوئے
کوئی دستک کبھی دیتا ہے تو ڈر جاتے ہیں

فیصل زمان چشتی

غزل

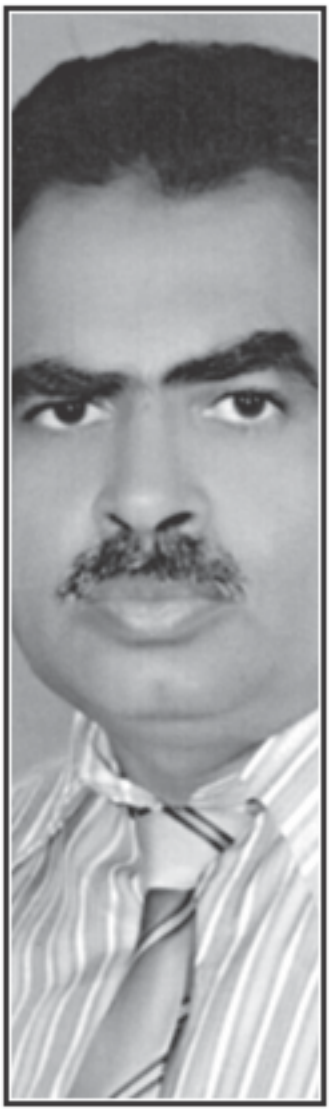

نیم وا آنکھوں میں پھیلا ایک یادوں کا سراب
دل مسافر دشت کا اس کا مقدر اضطراب

گاؤں کی کچی سڑک شہروں کی جانب لے گئی
سنگتیں ساری بچھڑ کر اب ہوئی ہیں ایک خواب

چودھویں کی رات میں سارا نگر مہکا ہوا
موتیے بکھرا گیا ہے چاندنی کے ، ماہتاب

صحبتِ گل میں چنبیلی موتیا ، مروا بھی ہے
آج تو چھایا ہوا ہے دل کی کیاری پر شباب

تنگ دل گلیوں میں کیسے لوگ یاں آباد ہیں
سب کے چہروں پر دھرے ہیں اجنبیت کے نقاب

کس کو اب ظلِ الٰہی کا لقب یہ لوگ دیں
نائبِ حق تو بنے بیٹھے ہیں خلقت پر عذاب

میں زمیں پر ایسا تنہا ہو گیا ہوں دیکھیے
خالی خالی آسماں پر جیسے تنہا اِک سحاب

اسلم سحاب ہاشمی

غزل

ہوائے ہجر کا میں سامنا نہیں کرتا
سو آندھیوں کے فسانے سنا نہیں کرتا

بھلے ہی موج میں بپھرا ہوا سمندر ہو
میں ناخدا پہ کبھی اکتفا نہیں کرتا

جمال یار نفاست پسند اتنا ہے
کہ ہر کسی کو تقرب عطا نہیں کرتا

یہ اختیار فقط ایک دو کی قسمت ہے
سبھی کو جنگ میں پرچم ملا نہیں کرتا

سفر میں سب کا یہ اپنا نصیب ہوتا ہے
وہ جان بوجھ کے خود سے جدا نہیں کرتا

جو مانگنا ہوں وہ لفظوں میں درج کرتا ہوں
میں شعر کہتا ہوں جامی دعا نہیں کرتا

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آج خالد ہمیں کاش جینے ہی دیں
چوکھٹوں میں جو کل ہم کو جڑ جائیں گے

غزل

نقش اس دن سے ہے اب تک وہ مرے دل پہ نماز
میں نے اک روز پڑھی تھی ترے آنچل پہ نماز

تارکِ صوم و صلا ہوں ترا دیوانہ ہوں
دین میں فرض کہاں ہے کسی پاگل پہ نماز

خاک کے لمس سے پیشانی کا رشتہ مفقود
پڑھتے ہیں قیمتی قالین کے مخمل پہ نماز

چاہئے جلدی کریں، ہاں مگر ایسا بھی نہیں
ہوتی مقبول ہے بس لمحۂ اول پہ نماز

ہاں اے سیّد کبھی گر وقتِ فضیلت ٹل جائے
چھائی رہتی ہے مسلسل دل بوجھل پہ نماز

حسن پرویز سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

غزل

کسی کی آنکھ میں رکھی گئی خماری ہے
وگرنہ کون یہاں اب مفید شہری ہے

یہ بھی نہیں جو مری زندگی سے یاری ہے
عجب طلسم ہے اس میں کہ پھر بھی پیاری ہے

یہ رنج و غم کی کتھا اور کہیں سنانا دوست
مرے جہان میں پہلے بھی سوگواری ہے

تمھارے لمس سے پہچان ہو گئی میری
مشینی کام نہیں ہے یہ دست کاری ہے

یہ کس نے ہاتھ میں باندھی خراب سی ہے گھڑی
یہ کس امیر نے میری یوں نقل اتاری ہے

وہ ایک لڑکی مرا جس سے واسطہ بھی نہیں
وہ ایک لڑکی مجھے سب سے بڑھ کے پیاری ہے

ہمارے ہوتے ہوئے قدر بھی کہاں تھی تمھیں
ہمارے بعد قمر، کیسی آہ و زاری ہے

قمر نیاز

غزل

پیار میں پیار کے آداب نہیں سمجھے گا
میری آنکھوں کے کبھی خواب نہیں سمجھے گا

غوطہ زن خود کو سمجھ لے گا بھگو کر پاؤں
اور مجھے عشق میں غرقاب نہیں سمجھے گا

سب سمجھ لے گا اداسی کی حقیقت، لیکن
اشک ریزی کے وہ اسباب نہیں سمجھے گا

وقت کے ساتھ مری قدر سمجھ جائے گا
کب تلک گوہرِ نایاب نہیں سمجھے گا

لاکھ سمجھاتا رہے صبر و رضا کی باتیں
کہہ دیا ہے دلِ بے تاب، نہیں سمجھے گا

اپنی خوش فہمی میں سب اچھا کہے گا لیکن
حالِ دل صورتِ سیماب نہیں سمجھے گا

آخرش سمجھیں گے سب بندۂ مزدور کے دکھ
کون آسائشِ کم خواب نہیں سمجھے گا

کون دنیا میں نہ سمجھے گا مقامِ مزدور
کون عظمت کو ابد تاب نہیں سمجھے گا

وہ ملا ہے تو ولی ساری خدائی پالی
کس لیے خود کو گہریاب نہیں سمجھے گا

شاہ روم خان ولی

غزل

پہلے تو کچھ بوندیں ٹپکیں پھر وہ بادل اتنا برسا
تن بھی جل تھل من بھی جل تھل سمجھو تم اک دریا برسا

کاگا بولا گھر کی چھت پر، تم آؤ گے شام سے پہلے
بن گئیں گلیاں رستے دریا پھر تو بادل ایسا برسا

اس چوبارے کے پچھواڑے سے بادل کا اک ٹکڑا نکلا
سارے فلک پر چھا کے پھر وہ ساون رت کے جیسا برسا

کالی گھٹائیں مہکی زلفیں ان شانوں پر آ کر بکھریں
نینوں میں پھر شام سی اتری آنکھوں سے پھر مدوا برسا

بھیگے بدن کی سوندھی خوشبو پھیل گئی پھر چاروں اور
جب جب بادل جھوم کے آیا جب بھی بادل گرجا برسا

ماں کے آنچل کی بنتوں میں اتنے سکھ لپٹے تھے احمد
جب بھی ماں کی چادر اوڑھی سکھ امرت کا دریا برسا

بشیر احمد حبیب

غزل

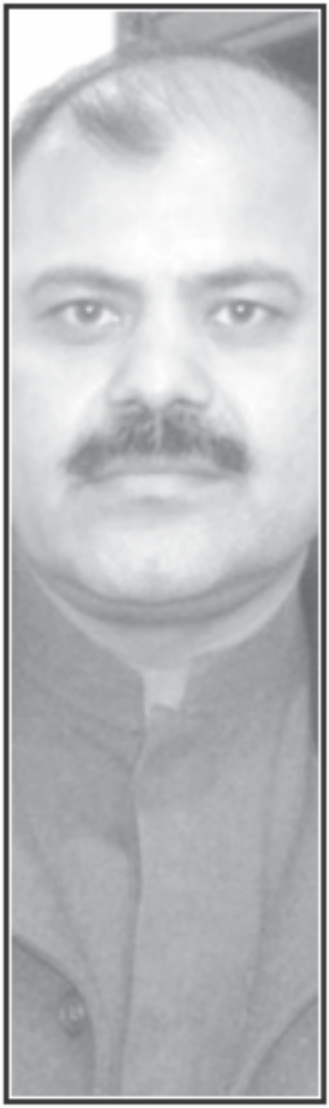

ڈوبتے وقت دِکھے مجھ کو بلاتے ہوئے لوگ
دور ساحل پہ کھڑے ہاتھ بڑھاتے ہوئے لوگ

ریگِ ساحل پہ مری پوروں کو دھیرے، دھیرے
دیکھتے ہیں تری تصویر بناتے ہوئے لوگ

عمر بھر محوِ سفر رہتے ہیں، مر جاتے ہیں
ایک دوجے کو سرِ راہ گراتے ہوئے لوگ

کوئی جادو سا جگا دیتے ہیں مایوسی میں
کوئی امید لیے، خواب دکھاتے ہوئے لوگ

جیت کر جنگ ، کچلتے ہوئے انسانوں کو
زہر لگتے ہیں مجھے، جشن مناتے ہوئے لوگ

ایک درویش کی چوکھٹ پہ پڑا ہوں شاہد
دیکھتا رہتا ہوں، آتے ہوئے، جاتے ہوئے لوگ

شاہد فرید

غزل

غم کو دل سے نکال دیتے ہیں
شعر میں اس کو ڈھال دیتے ہیں

دل کا طائر اگر کوئی پھڑکے
زلف کا اس کو جال دیتے ہیں

حسن کا تذکرہ کہیں آئے
لوگ تیری مثال دیتے ہیں

دیپ تیرے خیال کے اکثر
میرے دل کو اجال دیتے ہیں

تیرے شرمیلے نین تیکھے یہ
نِت نیا اک خیال دیتے ہیں

بارہا دن میں وہ جھگڑنے پر
خط ہمارے اچھال دیتے ہیں

اور رہتا نہیں کوئی عاصم
خود کو خود ہم زوال دیتے ہیں

محمد عاصم بخاری

غزل

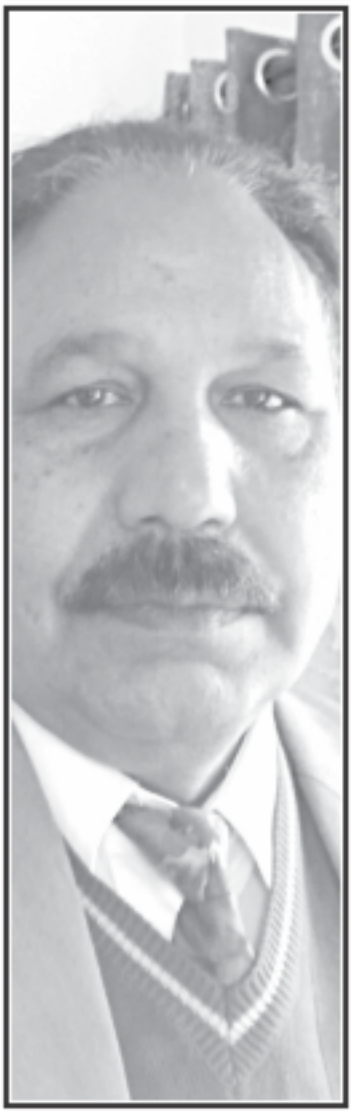

پھر سازِ تمنا پہ غزل گانے لگا ہوں
میں دل کے ہر اک داغ کو چمکانے لگا ہوں

ہنس ہنس کے گریباں نہ کبھی اپنا سیوں گا
آدابِ محبت سے میں کترانے لگا ہوں

بخشا ہے سرور اوروں کو خود زہر پیا ہے
اس دولتِ بیدار کو ٹھکرانے لگا ہوں

ابھرے گا مرے بخت کا ڈوبا ہوا تارا
پھر جرمِ وفا عشق کا دہرانے لگا ہوں

اب ایک نئے موڑ پہ ہے دل کی کہانی
اک زلف کو اب دوش پہ لہرانے لگا ہوں

جینے کا ہنر کش مکشِ غم میں ہے محسن
اپنے دلِ نادان کو سمجھانے لگا ہوں

میتھیو محسن

غزل

کرو کچھ روشنی آنگن میں میرے کہکشاں بن کر
اتر آیا مگر وہ گھر میں میرے آسماں بن کر

بڑی بے کیف اور بے رنگ سی ہے زندگی میری
نہیں معلوم کب آئے گا کوئی مہرباں بن کر

کہیں یہ مار ہی ڈالے نہ مجھ کو بے رخی تیری
یہ مجھ پر ٹوٹ پڑتی ہے قیامت ناگہاں بن کر

غلط تھے سب سوال اس کے میں کیا دیتا جواب اس کو
وہ میری زندگی میں آ گیا ہے امتحاں بن کر

محبت گر نہیں تجھ کو گوارا چھوڑ لینا سر
پڑا ہوں در پہ تیرے اب میں سنگِ آستاں بن کر

مری چاہت بھلا نہ پاؤ گے تم دل سے اے اشفاق
میں اکثر یاد آؤں گا مگر اک داستاں بن کر

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزل

کوکی گل

ہمیشہ راضی ہو رب کی رضا سے
نہ کرنا کوئی شکوہ بھی خدا سے

نہ ہو مغموم اپنے حال پر تو
بدل دے گا وہ تیری التجا سے

اتاری جو گئی پردے میں لپٹی
پریشاں ہے بڑی اپنی ردا سے

نہیں کوئی حسینہ بڑھ کے تجھ سے
تری سادہ دلی ، تیری حیا سے

بنے گا نغمہ کوکی! اک سریلا
ملا جب سر یہ تیرے ہمنوا سے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزل

جو بہت جان سے پیارا ہے مجھے
ہجر کب اس کا گوارا ہے مجھے

اک تری یاد اثاثہ ہے مرا
اور تو سارا خسارہ ہے مجھے

سامنے تو ہے تری خوشبو ہے
کیا میسر یہ نظارہ ہے مجھے

ایک امید پہ زندہ رہا ہوں
ایک احساس نے مارا ہے مجھے

اے غمِ یار تری سوچوں نے
کن مصائب سے گزارا ہے مجھے

آج پھر پیار کے لہجے میں اویس
اس نے دوری سے پکارا ہے مجھے

اویس اکبر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جلدی نہ کر، نظر سے اتر، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

غزل

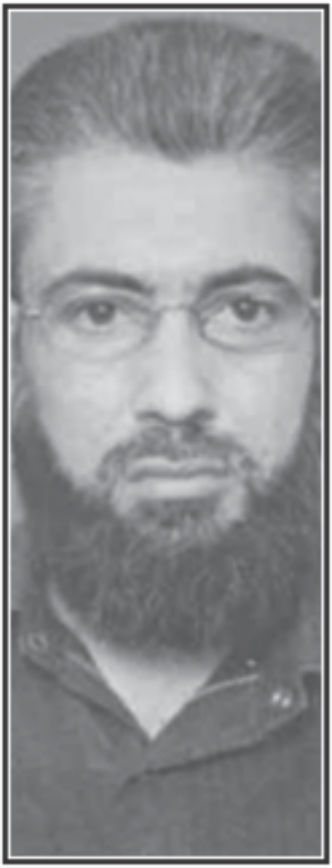

کوئی اٹھتا نہیں تلوار سے ڈر لگتا ہے
دشمنِ وقت کی یلغار سے ڈر لگتا ہے

اُٹھو اُٹھو ! میری آواز پہ لوگو اُٹھو
اُس کی بڑھتی ہوئی رفتار سے ڈر لگتا ہے

اس کڑے وقت میں لوگ اپنے تماشائی ہیں
ساتھ دیتے نہیں اظہار سے ڈر لگتا ہے

گھر کے ملبے میں نہ دب جائیں یہ ڈرنے والے
اپنے خستہ در و دیوار سے ڈر لگتا ہے

کسی مظلوم کی محفوظ نہیں ہے عزت
دیکھ کر صورتِ آزار سے ڈر لگتا ہے

سرکٹاتے ہی چلے جاتے ہیں لوگ اپنے حکیم
اب ہمیں جبہ و دستار سے ڈر لگتا ہے

حکیم خان حکیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گنگ ہونٹوں کے سخن دیدۂ تر سے سُنیے
ایک چرچا ہے ، اگر گوشِ نظر سے سُنیے

غزل

رخسانہ سمن

سخن کی جھیل میں تازہ کنول نکل آئے
میں تم کو ذہن میں لاؤں غزل نکل آئے

ترے خیال کو بیٹھی دعائیں دیتی ہوں
کہ میرے کتنے مسایل کے حل نکل آئے

تری جدائی طلسمی وجود رکھتی ہے
خوشی کے دور میں رونے کے پل نکل آئے

ہمیں نہیں تھی گوارا زمیں کی پسپائی
سو ہم فلک کی نگاہوں سے کل نکل آئے

وہ شخص ریت کی مٹھی پہ کر رہا تھا غرور
ہماری آنکھ سے کتنے ہی تھل نکل آئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لے جائیں گی کہاں مجھے تنہائیاں مری
وُسعت پذیر ہیں ابھی پہنائیاں مری

غزل

دل کہہ رہا ہے میرا مگر کس طرح کروں
اتنا طویل تنہا سفر کس طرح کروں

ہر سانس چاہتی ہے ترا ساتھ مستقل
اک دن بھی بن ترے میں بسر کس طرح کروں

سایہ بھلے نہیں ہے ہماری طرف تو کیا
شکوہ تمہارا بوڑھے شجر کس طرح کروں

کتنی ملامتیں ہیں بغل گیر آ کے دیکھ
خواہش کسی کی بارِ دگر کس طرح کروں

رونا میں چاہتا ہوں کسی قہقہے پہ آج
منت میں ہنستی آنکھ کی پر کس طرح کروں

کافی سمجھ اسے تجھے جینا سکھا دیا
اب دان تجھ کو سارے ہنر کس طرح کروں

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز تجھ کو قریہ قریہ ڈھونڈنے جاتا ہُوں مَیں
روز اِک دشتِ محبت چھان کر آتا ہُوں مَیں

غزل

مانگی دعا ہے دل سے جو تجھ پر کیا ہے غور
گزرے نہ تیرے حسن کا یہ لاجواب دور

جتنا بھی تجھ کو غور سے دیکھوں میں جانِ جاں
آتی ہے دل سے پھر بھی صدا ایک بار اور

تو جو کرے وفا کہ جفا ایک بات ہے
پیارا ہے مجھ کو جان سے تیرا ہر ایک طور

میں تو سدا رہوں گا ترے ساتھ رشکِ گل
سانسوں کی جب تلک بھی سلامت رہے گی ڈور

دو جھیل جیسی آنکھیں چُرا لے گئی ہیں دل
لیکن شہاب کہہ نہیں سکتا انھیں میں چور

شہاب اللہ شہاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر میل پہ وہ پتھر لگوائے ، نہ لگوائے
سورج ہوں ، دیا کوئی دکھلائے نہ دکھلائے

غزل

تھا معترف زمانہ مرے جس کمال کا
صد حیف بن گیا وہی باعث زوال کا

غیروں میں بھی گوارا نہیں جس کو میرا نام
محور بنا ہے وہ مرے خواب و خیال کا

پوچھا جب اُس نے شامِ جدائی میں دل کا حال
ہم سے جواب بن نہیں پایا سوال کا

جنسِ طلب ہماری پہنچ میں نہ تھی مگر
ہم شہرِ دل سے کاسہ بھر آئے ملال کا

نعمان کا نصیب سفر دائرے کا ہے
تُو حال دیکھ تو سہی اپنے نڈھال کا

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مَیں سَمندر تھا، مگر ویراں تھا صحرا کی طرح
میرے گھر تک چل کے آتا، اتنا پیاسا کون تھا

غزل

موسموں کا فریب ہی تھا یہ
عشق کے ہم کہاں کے قائل تھے

خود فریبی کا نشہ اچھا تھا
کسی کے ساتھ پہ تو مائل تھے

راہ چلتے ہوئے جو گرتے ہیں اب
سوچتے ہیں ہم ہی تو سائل تھے

مسکرانا بھی بھولے بیٹھے ہیں
اب طبیعت کے یہی خصائل تھے

کہیں دو لوگ بیٹھے مل جائیں
ہنستا ہوں ایسے ہی مراحل تھے

شائستہ رمضان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پَل پَل کی روک ٹوک سے رُکنے لگا ہے دم
اے ضبط ، چھوڑ ، یار بہت روز جی لیے

غزل

غضنفر مہدی

شبِ غم جب منائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا
وہ بزمِ دل سجائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

اکیلی رات میں سارے زمانے کو بھلا کر وہ
مری یادیں سجائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

مری ہی یاد کا موسم رہے گا آنکھ میں جل تھل
وہ جب بھی مسکرائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

وہ آدھی رات کو چھت پر اکیلا جب کھڑا ہوگا
فلک پر چاند آئے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

وہاں ہر ایک آہٹ پر گماں اُس کو مرا ہوگا
نہ مجھ کو پاس پائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

مری سب نسبتیں اُس کو ستائیں گی، رلائیں گی
پُرانے خط جلائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

اُسی کے نام پر مہدی جو میں نے گیت لکھے ہیں
اُسے کوئی سنائے گا تو کاجل بھیگ جائے گا

غزل

گناہگار ہوں شوقِ ثواب میں چپ ہوں
وہی بلائے گا جس کی جناب میں چپ ہوں

اداس ہو گئے مجھ پر چٹکھاڑنے والے
تمام نقد و نظر کے جواب میں چپ ہوں

نہیں کسی کو ضرورت کہ حالِ دل سمجھے
خوشی خوشی ہوں کہ یارو! عذاب میں چپ ہوں

تمام شہر مری کیفیت سمجھتا ہے
عجیب بات کسی کے حساب میں چپ ہوں

کوئی بھی کہتا نہیں مجھ سے بولنے کے لیے
میں جاگتے میں جیا ہوں کہ خواب میں چپ ہوں

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چلو دل اُس کا وفا دار کر کے دیکھتے ہیں
خدا کے ساتھ یہ بیوپار کر کے دیکھتے ہیں

غزل

آپ اب مجھ پر ذرا سا حق جتائیں صاحبا
تھوڑی سی میرے لیے کر دیں دعائیں صاحبا

کوئی الزامات کی گٹھڑی تھما بھی دیں مجھے
ہاتھ خالی چھوڑ کر ایسے نہ جائیں صاحبا

آنکھ سے آنسو گرا تھا آپ کی، اس واسطے
شہر بھر کے میکدے اب ڈگمگائیں صاحبا

ہم فقیر اب بے بسی کے پیرہن میں شام کو
اجنبی سی وحشتوں سے مات کھائیں صاحبا

اپنے کمرے سے نکلتا ہی نہیں جس شخص نے
رات دن سے کس طرح کرتا وفائیں صاحبا

اس جگہ پر تو کوئی ناراض بھی ہوتا نہیں
اب لگا کر ہم گلے کس کو منائیں صاحبا؟

آج غم کا زور ہے اور درد بھی انمول ہے
دھیمے سے لہجے میں کوئی سُر لگائیں صاحبا

میں تسلسل ڈھونڈتا ہوں زندگی میں بے بہا
مجھ کو قربت، فاصلے، رستے تھکائیں صاحبا

کیا عجب کہ ہم سے اجلے چہروں کے بھی درمیاں
دھندلی سی ہیں زمانے کی روائیں صاحبا

زندگی کے اس سفر میں کوئی پابندی نہیں
جب نبھانا ہی نہیں تو چھوڑ جائیں صاحبہ

ہنزلہ شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ذہن میں یاد یار سا، کچھ ہے
ایک جھلمل غبار سا، کچھ ہے

غزل

نہیں شکوے شکایت طنز کا شیوہ مگر توبہ
وہ غصے میں زباں سے کچھ نہیں کہتا مگر توبہ

زمین و آسماں کی کل طنابیں کھینچ کر رکھ دیں
فقط ماتھے پہ اپنے ایک بل ڈالا! مگر توبہ

ہزاروں بار کرتا ہے وفورِ شوق دلداری
ہزاروں بار توڑو گے بتاؤ کیا مگر توبہ

بتوں کے شہر میں رہتے ہوئے کافر نہیں ہیں ہم
خدا کے خوف سے کہتے ہیں سب ایسا مگر توبہ

تپش سے لمس کی برقاب گر ہیں کھولتا ہے وہ
یہ جادو کس بلا کا ہے، بتائیں کیا، مگر توبہ

بلائے تشنگی ہر دور میں میراث ہے دل کی
سمندر کے سمندر پی گیا پیاسا مگر توبہ

خیال و وہم و حیلہ ہے فریبِ زندگی پیہم
کرو اس واہمے سے لاکھ سمجھوتہ مگر توبہ

نگاہیں ہونٹ اور قامت۔۔۔ متاعِ ناز اور حکمت
حضورِ یار گو کرتے نہیں توبہ۔۔۔ مگر توبہ

وہ باغِ آرزو، جوشِ نمو، وہ رنگ و بو نینا
بظاہر تو نہیں ایمان کو خطرہ۔۔۔ مگر توبہ

تمھارے دوستوں سے جیسے ہم واقف نہیں عادل
وظیفہ رات دن کا ہے "احب اللہ" مگر توبہ

نینا عادل

کالے منہ والے

جب بادشاہ کے سپاہی غداروں کی بستیوں سے واپس لوٹے تو شاہی قلعے کے محافظ نے انہیں دیکھتے ہوئے اہانت سے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ تم سب کے منہ کالک سے بھرے ہوئے ہیں یہ تمہیں کسی جرم کی سزا ملی ہے۔ یا کوئی لعنتی آسیب تم سے آچمٹا ہے۔ سپاہیوں نے انا اور غصے میں اُسے جھڑکنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک تجربہ کار سپاہی بولا۔ ہمیں روشنی میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ لینا چاہیے۔ کہیں سچ مچ ہمارے چہرے کالک سے بگڑے ہوئے ہوئے نہ ہوں۔ محافظ ان سب کو محل کے ایک روشن کمرے میں لے جا کر بولا۔ لو دیکھ لو۔ ایک دوسرے کا منہ۔ تم نے ایک دوسرے سے اپنا منہ چھپانے کی کوشش کی ہوئی ہے یا تمھارے کالے کرتوت کی پھٹکار تمھارے چہروں پہ آپڑی ہے۔ سپاہی ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر کھسیانے ہونے لگے۔ وہ کل پانچ تھے اور سب کے چہرے اتنے کالے اور بھیانک ہو چکے تھے کہ انھیں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ بوڑھا سپاہی سنجیدہ اور پشیمان ہو کر بولا۔ ہم غداروں کی بستی میں سے صرف چند گھروں پہ حملہ آور ہوئے تھے۔ اور انتقام اور اختیار کے نشے میں سپاہی جو کیا کرتے ہیں۔ ہم نے وہی کیا ہے۔ اور پھر ہمیں بادشاہ کا حکم بھی یہی تھا کہ جوان مردوں کو ہلاک کر کے کنواریوں کو اُٹھا نہ سکو تو کسی کے قابل نہ چھوڑنا۔ ہم نے درودیوار مسمار کر کے ہر شے راکھ بنا دی تھی۔ لیکن یہ تو ہم شروع ہی سے کرتے چلے آرہے ہیں ایک سپاہی چہرے پہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا، استاد تم بھول رہے ہو۔ ہم نے چند بوڑھے اُٹھا لیے تھے اور اُنہیں پہاڑوں میں لے جا کر ہلاک کر آئے تھے ہاں ہاں۔ بوڑھا سپاہی فخر اور مسرت سے بولا، ہم نے چار بوڑھے اُٹھا لیے تھے۔ اُنھیں گھوڑوں پر لاد کر ہم کالے پہاڑوں میں لے گئے تھے۔ وہاں رات کے اندھیرے میں ہم نے اُنھیں پتھر مار مار کر کے ہلاک کر ڈالا، بادشاہ کا یہی حکم تھا کیونکہ ان بوڑھوں کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بس تو ان پہاڑوں سے کچھ ایسا

کلیم خارجی

ہوگیا ہے۔ چلو منہ دھو کر بادشاہ کو اپنی کامیاب واردات کا حال سنا کر اس کی خوشنودی حاصل کریں محافظ انھیں حمام کی طرف لے جاتے ہوئے شرارت سے بولا، میرے بھائیو تم سب کے خدوخال مٹ گئے ہیں۔ صرف کالا منہ سا رہ گیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ دھونے سے کچھ فرق پڑے گا بوڑھا سپاہی غصے اور حقارت سے بولا، تم اگر ایسا سوچ رہے ہو۔ تو پھر تمھیں بھی اپنے جیسا کر کے چھوڑیں گے۔ تمھاری ناک اور کان کاٹ کر تمھیں عبرت کا نشان بنا دیں گے۔ لیکن بہت دیر تک نہانے اور منہ دھونے کے بعد جب وہ اپنے نئے کپڑے پہن کر باہر نکلے تو شاہی محل کے دو نوجوان خادموں نے حیرت اور خوف سے چیختے ہوئے کہا، بہادر سپاہیوں تمہارے چہرے پر عجیب سی کالک چمٹی ہوئی ہے۔ ایک سپاہی نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا، خاموش ہو جاؤ احمقو۔ ہم نے جان بوجھ کر منہ کالے کر رکھے ہیں۔ چند نوعمر خواجہ سرا بھی اُس طرف آ نکلے تھے۔ ایک مست سپاہی نے اُنہیں اپنی طرف اشارہ کر کے بلایا۔ اور ایک کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مستی سے بولا، اگر تم جلدی آ جاتے۔ تو کم از کم نہانے اور صابن ملنے میں تو ہماری مدد کر سکتے تھے۔ سپاہی کی بات سن کر وہ گھبرا کے بھاگے اور محل کے ستونوں کے پیچھے کہیں غائب ہو گئے۔ بوڑھا سپاہی نہانے کے بعد اگرچہ ہشاش بشاش ہو کر زمین پہ پاؤں رکھنے لگا تھا اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنے قریب بلا کر اُن کے درمیان کھڑا ہو کر بولا، ہمارے منہ پہ چمٹی ہوئی کالک نہیں اُتری۔ مجھے یہ بات بہت خوفزدہ کرنے لگی ہے، کہیں ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔ کیا بادشاہ ہمیں پہچان لے گا۔ کیا وہ اپنے پسندیدہ کام کی تکمیل کے بعد ہمیں عزت اور دولت سے نوازے گا۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا، اگر بادشاہ کو ہماری شکلیں دیکھ کر غصہ آ گیا تو کیا ہم ان لوگوں کی بددعاؤں کا شکار ہو جائیں گے جنھیں ہم پامال کر کے موت کے گھاٹ اُتار آئے ہیں۔

چنانچہ یوں کرتے ہیں کہ بادشاہ کے حاضری دینے سے پہلے اس کے وزیر خاص سے ملتے ہیں جو تنہائی میں بادشاہ کو بادشاہ رہنے کے اُصول اور قاعدے سمجھا کر اس کے دل و دماغ پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کا ہنر جانتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے چاروں سورماؤں کو لے جا کر بادشاہ کے وزیر خاص کے محل میں جا پہنچا۔ شام کے اندھیرے گہرے ہو چکے تھے اور آسمان تاروں سے بھرتا جا رہا تھا وزیر خاص کی پُرکشش خادمہ نے اُنہیں دیوان خانے میں بٹھا کر وزیر خاص کو اطلاع دی تو وہ نشے میں جھومتا ہوا دیوان خانے میں آتے ہی قالین پہ گر پڑا۔ خادمہ نے اُسے اُٹھا کر بٹھایا تو وہ کھڑے ہوتے ہی خادمہ سے چمٹ کر دیوان خانے میں موجود پانچ کالے منہ والے مردوں کو پہلے تو خوف اور حیرت سے گھورتا رہا۔ بوڑھے سپاہی نے عاجزی سے اس کے قریب

جا کر کہا حضور والا، ہم بادشاہ کے خاص غارت گر ہیں۔ ہمیں آپ نے منتخب و مقرر کر کے ہمیں جینے کا سہارا دے رکھا ہے ابھی چند دن پہلے ہم نے آپ کے حکم سے شہر کے قاضی کے گھر آگ لگا کر اس کے خاندان کے سارے افراد جلا کر راکھ بنا دیئے تھے۔

ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا۔ وزیر خاص نے پُرکشش خادمہ کی سفید کلائی پہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں گھونپتے کہا۔ لیکن تمھارے چہرے تو کبھی ایسے نہ تھے۔ تم کالے کالے کیوں نظر آ رہے ہو؟ بس اسی شکل کی وجہ سے ہم آپکی خدمت میں آئے ہیں۔ کہ کہیں بادشاہ ہمیں پہچاننے سے مکر نہ جائے۔ یا ہمارے منہ دیکھ کر مشتعل نہ ہو جائے۔ ہم کیا کریں کیا ہم بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے غارتگری کا کارنامہ پیش کر کے بادشاہ کو نہال کر پائیں گے۔ وزیر خاص نے اپنی پشت خادمہ کے بدن سے پیوست کر کے اس کی بانہیں کھینچ کر اپنی توند پر رکھتے ہوئے اس کی انگلیوں سے ایسی حرکتیں شروع کیں۔ کہ بوڑھے سپاہی کو اپنے چاروں جوان سپاہیوں کو دیوان خانے سے باہر نکل کر محل کے دروازے پہ کھڑے ہونے کا حکم دے دیا۔

وزیر خاص چہکتے ہوئے بوڑھے سپاہی سے بولا، تم انتہائی زیرک اور دانشمند آدمی ہو۔ میں تمھیں ہر حالت میں اپنے لیے محفوظ اور سلامت رکھوں گا۔ لیکن یہ بتلاؤ کہ غداروں کو غارت کرتے ہوئے کہیں تمھارے دل پچھتاؤں اور رحم سے پگھل تو نہیں گئے کہ دھواں تمہارے منہ پہ آ کر جم گیا۔

نہیں ہرگز نہیں۔ بوڑھا سپاہی دلیری اور اعتماد سے بولا، ہم بے ضمیر اور ظالم، بے رحم ہیں۔ ہماری تربیت ایسی ہے کہ پچھتاوے اور ضمیر نام کی کوئی چیز ہمارے اندر باقی نہیں رہی۔ جبکہ ہم جانتے تھے کہ غداروں کی بستی میں وہ لوگ ہیں۔ جو یہاں کے قدیم وارث ہیں۔ بادشاہ نے انہیں محروم کر کے انہیں ہر طرح سے نیچ اور کمزور کر کے رکھنا ہے۔ ہم نے آپ اور بادشاہ کی زندگی اور طاقت کے لیے غداروں کو ہر وقت مشکل، مصیبت اور مایوسیوں میں مبتلا رکھنا ہے۔ ہم غارت گر ہیں۔ اور بادشاہ کے خاص منصوبوں کے لیے وقف ہیں۔ ہم نے قاضی کے محل اور اس کے خاندان کو آگ میں جھونک دیا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے چہرے سرخ اور خوفناک تھے مگر اس مرتبہ ہم پر کوئی نحوست طاری ہو چکی ہے۔

وزیر خاص کچھ دیر گم سم کھڑا اپنی خادمہ کے بانہوں میں بندھا رہا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی خادمہ نے وزیر خاص کو بھیجتے ہوئے کہا، میرے مالک و آقا۔ مہمان بہت تھکے ہوئے اور پریشان لگتے ہیں۔ کیوں نا انہیں اچھے کھانوں سے لطف اُٹھانے کا موقع دیا جائے۔ اس وقت آپ آرام کر لیں گے۔ تا کہ معاملات کو اچھی طرح سے سلجھا سکیں۔ وزیر خاص نے مستی میں گردن موڑ کر

اپنی پشت سے جڑی ہوئی خادمہ کو دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔ تم نے بہت بہترین بات کی۔ مہمانوں کے لیے ضیافت کا بندوبست کیا جائے۔ اس طرح ہمیں کچھ بہتر سوچ لینے کا وقت میسر آ جائے گا۔

کالے منہ والے تھکے ہوئے بھوک سے پٹے ہوئے سپاہیوں کو محل کے طعام خانے کی طرف لے جایا گیا اور وزیر خاص خادمہ کی بانہوں میں جھومتے ہوئے اپنی خلوت گاہ میں داخل ہو گیا۔

اگلی صبح بادشاہ کے محل کے قریب پہنچ کر وزیر خاص نے پانچوں سپاہیوں کے قریب کھڑا ہو کر بادشاہ کے مزاج اور بدلتے ہوئے رویوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ میں تمہارا وکیل بھی ہوں، محافظ بھی، دوست اور رہنما بھی ہوں۔ یاد رکھو تمھاری خاموشی تمھاری قیمت اور اہمیت میں اضافہ کرے گی۔

بادشاہ اپنے دربار میں وزیر مشیروں سے بحث و مباحثہ میں مصروف تھا کہ ملک میں سرخ پہاڑوں کی وادی اور دریا کے کناروں پہ جھونپڑیوں میں بسنے والے غداروں کو کس کس طرح سے معذور و مایوس رکھا جا سکتا ہے۔ بادشاہ پھلوں کا تازہ رس پیتے ہوئے، کھنکارتے ہوئے بولا، میرے عزیز دوچ بات تو یہ ہے۔ کہ مجھے اپنے وفاداروں سے زیادہ غداروں کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ ہم غداروں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن عبرت اور مایوسی کا نمونہ بنا کر، دریاؤں کے کنارے بسنے والے غداروں کو دریاؤں سے مچھلیاں مل رہی ہیں اور ان کی کشتیاں پانیوں پہ تیرتی ہوئی دوسرے کناروں پہ جا رکتی ہیں۔ یوں بیرونی دشمنوں سے ان کی ملاقاتوں کا امکان بھی ہوتا ہے، یکا یک بادشاہ اپنے وزیر خاص کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔ وزیر خاص نے فرشی سلام ادا کرتے ہوئے کہا، بادشاہ سلامت اس مرتبہ میری خاص حکمت عملی کام آ گئی۔ ہمارے سپاہی غداروں کے سینکڑوں مردوں پہ بھاری رہے۔ کوئی جوان، کوئی نوعمر مرد زندہ نہیں بچا۔ دانشمند بوڑھے پتھروں تلے زندہ دب گئے۔ سرخ پہاڑوں کی وادی میں رہنے والوں کے پاس سوائے بادشاہ سلامت کی طاقت اور رعب کو دیکھنے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ غداروں کی جوان عورتیں، معذور اور بدشکل ہو کر زندہ رہیں گی۔ اور باقی حاملہ ہو کر بے بس اور ماتم گزار رہ کر بادشاہ سلامت سے رحم کی بھیک مانگتی رہیں گی۔ بادشاہ خوشی میں مسکراتے ہوئے وزیر خاص کو تعریفی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ وزیر خاص نے تالی بجا کر کالے منہ والے پانچ سپاہیوں کو دربار میں اندر بلایا۔ جیسے ہی وہ پانچوں دربار میں داخل ہوئے۔ بادشاہ اور اس کے دوسرے وزیر چونک کر انہیں دیکھتے رہے۔ موقع دیکھ کر وزیر خاص نے سنسنی خیز خاموشی توڑتے ہوئے فخر سے

سینہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ بادشاہ سلامت یہ میری حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ وزیر پانچوں سورے بہت خوبصورت اور صحت مند خدوخال رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے چہروں کو بھیانک اور خوفناک روپ دے کر غداروں کی بستی میں بھیجا انہیں ذرا سی چوٹ بھی نہیں آئی اور یہ پانچ لوگ درجنوں سپاہیوں والی کامیابی سمیٹ کر واپس لوٹے ہیں۔ بادشاہ اپنی شہادت کی انگلی منہ میں دبائے اٹھتے ہوئے پھر تخت پہ دھنستے ہوئے جم گیا۔ تو وزیر خاص نے پھر اپنی بات شروع کی۔ بادشاہ سلامت میں نے ان کے چہروں پہ سیاہی مل کر انسانی ہمدردی، احساس اور رحم کی شکنیں ہی مٹا ڈالیں۔ تاکہ یہ صرف بادشاہ اور بادشاہت کے لیے قتل وغارت کو اپنی زندگی کا سب سے اولین اور اہم مقصد سمجھیں۔ ان کے چہروں پہ آپ کی وفاداری، بے رحمی اور بے دردی کے سوا اب کچھ باقی نہیں رہا۔ یہ سپاہی جب تک زندہ رہیں گے۔ تب تک ان کے منہ کالے ہی رہیں گے اور یہ صرف آپ کے لیے مرنے اور مارنے کا کام کرتے رہیں گے۔ بادشاہ رقص کرتے ہوئے اٹھا اور جوش میں لرزتے ہوئے سپاہیوں کے قریب آکر بولا، ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ ہمارے تو جیسے پر نکل آئے ہیں یہ خیال، یہ سوچ پہلے کیوں نہ کسی کے دماغ میں پیدا ہوسکی۔ پھر اس نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ محل کی کنیزیں، جاگیریں، مال مویشی، اناج، شہد وشراب جو یہ جس قدر چاہیں۔ ان کی تاعمر تقدیر بلکہ ان کی نسلوں کی میراث میں شامل کر دیا جائے۔ خوشی سے روتے، لرزتے سپاہیوں کو رخصت کرنے کے بعد بادشاہ سلامت نے وزیر خاص کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ فوج کے تمام سرداروں، سپہ سالاروں اور سورماؤں کو طلب کیا جائے اور ان کے منہ کالے کر دیئے جائیں۔ تاکہ ان کی وفاداری ور ان کی ذمہ داری اور وفاداری کے بارے میں اس زمین پر بسنے والے ہر شخص کو خبر ہو سکے۔ بادشاہ نے دربار میں موجود وزیر خاص اور باقی تمام وزیروں اور مصاحبوں کے منہ کالے کرنے کا حکم دے دیا اور خود بیٹھ کر دربار میں سب کے منہ پر کالک ملتے ہوئے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ پھر چند ہی دنوں میں محل، دربار، فوجی قلعوں، بازاروں اور گلیوں میں کالے منہ والے سورے نظر آنے لگے۔ لوگ سہم کر ان کے رستوں سے دور ہٹ جاتے۔ بچے، عورتیں اور کمزور دل والے لوگ کالے منہ والے محافظوں کو دیکھ کر اندھیری گلیوں میں چھپ جاتے۔

بہت دنوں کے بعد ایک بار پھر بادشاہ کو دریاؤں کے کنارے اور سرخ پہاڑوں کی وادی میں غداروں کی بستیوں میں اپنے سورے بھیجنے کا شوق چرایا۔ مہم کے لیے بے رحم اور طاقتور سپاہی منتخب کیے گئے۔ دریا

کی بستی کی طرف جانے والا لشکری جب بستی میں داخل ہوئے تو وہ حیرت اور پریشانی میں اپنے اپنے گھوڑوں پر ہی جمے بیٹھے رہ گئے۔ غداروں کی بستی سے کالے منہ والے کئی نوجوان باہر آ کر ان کے گھوڑوں کے پاس آ کر کھڑے ہو کر گھڑ سواروں کو دیکھنے لگے ۔ پھر ایک بھاری آواز والا بوڑھا سپاہیوں کے سردار کے قریب جا کر اعتماد سے بولا، ہم نے ہر اک شے راکھ کر ڈالی ہے ۔ ہمارے منہ کالے ہیں لیکن ہم پر بادشاہ کا سایہ ہے۔ ہم اندر سے بادشاہ کے لیے روشن اور مضبوط ہیں۔ ہم نے یہاں وہ سب کچھ کر دیا ہے ۔ جو ہمیں کرنا چاہیے تھا افسوس ہم نے تمہارے کرنے کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھا سردار اپنے سامنے زمین پہ کھڑے بیس پچیس آدمیوں کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا، ہم گھوڑوں پہ تھے۔ اور تم پیادہ لیکن تم شاید ہم سے بہت پہلے ہی نکل چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بادشاہ کے خاص غارتگروں میں صرف ہم لوگ شامل ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور گھوڑے کا منہ پیچھے کی طرف موڑتے ہوئے چیخا۔ میرے پیچھے ہو کر چلتے آؤ۔ ہم غداروں کو غارت کرنے والے اور بادشاہ کے دشمنوں کو ذلت کی موت مارنے والے سورمے ہیں۔ گھڑ سواروں کے پیچھے چلتا ہوا ہجوم جب بادشاہ کے فوجی قلعے میں داخل ہوا تو وہاں سرخ پہاڑوں سے واپس لوٹے ہوئے کالے منہ والے لشکریوں کا اک بڑا ہجوم بھنبھنا رہا تھا ۔ تمام سپاہیوں اور سرداروں کو بادشاہ کی آمد کا انتظار تھا۔ بہت بے چینی اور دیر کے بعد بادشاہ اپنی شاندار رتھ میں قلعے میں داخل ہوا تو جنگی قلعہ ہجوم کے نعروں گونج اٹھا۔ بادشاہ کالے منہ والے محافظوں اور وزیروں کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنے سرخ و سفید چہرے کے ساتھ کوئی آسمانی دیوتا نظر آ رہا تھا۔ قلعے میں موجود سپاہی بادشاہ کے رعب اور حسن و جمال کو دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ کالے منہ والے دو دیوہیکل محافظوں نے بادشاہ کو اپنی حفاظت میں قلعے کے درمیان سنگ مرمر کے بلند و بالا چبوترے پہ پہنچایا۔ تو ہجوم نے دوبارہ نعرے لگانا شروع کر دیئے ۔ بادشاہ نے دھوپ میں چمکتے ہوئے سفید اور گلابی ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کے نعروں کا جواب دیا اور پھر دونوں بازو بلند کر کے اس نے سپاہیوں کے ہجوم کو چپ کرایا سب نے بادشاہ کی سفید و سرخ کلائیوں کو دیکھ کر حسرت سے مسکرانا شروع کیا۔ سپاہیوں کا شور تھما تو بادشاہ بولا، میرے وفادار اور بہادر سپاہیو! میرے لیے اپنا منہ کالا کر کے فتح اور طاقت کا سبب بننے والو میں جانتا ہوں۔ تمہارے سینوں میں تمہارے مضبوط دل روشن اور خوبصورت ہیں۔ تمہارے منہ

کالے ہیں لیکن تمھارے کارنامے چاند ستاروں کی طرح اس سرزمین کو روشن رکھیں گے۔ تمھارے چہروں کی سیاہی دراصل تمھارا وعدہ، اور تمہاری قسم ہے۔ کہ تم میرے ملک اور آئندہ آنے والی نسلوں کے وفادار محافظ ہو۔ میں نے تمھارے لیے بہت سے لوگوں کو محروم، مفلس، بھوکا اور ننگا کر کے خزانے بھر رکھے ہیں۔ اس زمین پہ جس جگہ پہ پاؤں رکھ کر تم کھڑے ہو جاؤ گے وہاں سے لیکر جہاں تک تم چاہو زمین تمھاری ہے۔ وہ تمام لوگ جن کے چہرے، حلیے اور اعمال تم جیسے نہیں۔ تم ان کی زندگی، جان اور مال، عزت اور غیرت کا فیصلہ اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔ تمھارے چہروں کی کالک نے تمھیں اس زمین پہ طاقت اور اختیار اطمینان کا ہر وہ حق دے رکھا ہے۔ جو تم استعمال کرنے کے خواہش رکھتے ہو۔

بادشاہ سانس لینے کے لیے چپ ہوا۔ تو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے کالے منہ والے تمام مصاحبوں اور وزیروں نے مقدس دُعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ سپاہیوں کے ہجوم پر ایک پراسراری کیفیت طاری ہوگئی۔ تو بادشاہ کے لہجے میں بہت زیادہ جوش اُبھر آیا۔ اور وہ نعرے لگاتے ہوئے بولا، دیکھو، میرا بادشاہ بن جانا۔ آسمانی طاقتوں کی خواہش اور منشا ہے۔ سو اب تم ہر اس چہرے کی حفاظت اور عزت کرنے کی پابند ٹھہرے ہو۔ جن کے چہرے اور رنگ میرے اور میرے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں اب میں اور میرا خاندان اپنے رنگ و روپ کی وجہ سے تم سے افضل ہونے کے ساتھ ساتھ تم پر حکمرانی کا دائمی حق رکھتا ہے۔ سو اب تم ہر اس شخص کی جان لے سکتے ہو۔ جسکا رنگ و روپ تو مجھ جیسا ہے۔ لیکن وہ میرے کسی رشتے اور قرابت داری میں نہیں آتا۔ جاؤ سرخ پہاڑوں، اور دریا کے کنارے بسنے والے تمام سفید و سرخ چہرے والوں کو ہلاک کر ڈالو۔ محل، کلوں، دیوان خانوں، حویلیوں کی چار دیواری سے دُور ہر وہ شخص جسکا منہ کالا نہیں ہے۔ موت کے گھاٹ اُتارے جانے کے لائق ہے۔

بادشاہ کی پرجوش تقریب ختم ہوئی تو سپاہیوں کے ہجوم میں سے کسی نے سرگوشی کی۔ بادشاہ نے ہمارے منہ کالے کر ہمیں اور ہماری نسلوں کو دائمی طور پر کالا رکھنے کا قانون بنا دیا ہے۔ وہ ہمارے منہ کی کالک کو قدرت کا فیصلہ بھی قرار دے چکا ہے۔ اس نے اپنی اور اپنے خاندان کی تقدیر کو ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ سپاہیوں کے ہجوم میں خوف، افراتفری کی وجہ سے بے چینی پیدا ہوگئی بادشاہ کے پرانے سردار دھاڑتے ہوئے چبوترے پہ چڑھ کر بادشاہ کو اپنی حفاظت میں لیکر سپاہیوں کی آوازوں کو خاموش کروانے کے لیے پہنچنے لگے ایک موٹا پہرہ دار چبوترے کے کنارے تک آ گیا۔ اور تلوار لہراتے ہوئے چیخا، ایک بغاوت بھری آواز

سن لی گئی ہے۔ اور اسکا پتہ چلا لیا جائے گا۔ یہ آدمی ڈھونڈ لیا جائے گا۔ اور ہمیں اُس چبوترے پہ اس کا سر قلم کیا جائے گا۔ سپاہیوں کے لشکر کافی دیر خاموش کھڑے رہے سب کے منہ کالے تھے سب ایک جیسے تھے لیکن بغاوت بھری سرگوشیاں کرنے والا کوئی سامنے نہیں آیا۔ آخر بادشاہ کو گلا پھاڑ کے بولنا پڑا۔ میری فوج، بہادر، دہشت ناک، بے رحم ہے اور یہ ہر دم فتح کرنے کو تیار رہتی ہے۔ ایک کمزور سی آواز کی خاطر۔ میں اپنے وفادار لشکریوں پہ شک نہیں کر سکتا۔ جاؤ نکل پڑو اور جسکا چہرہ حلیہ اور لباس تم جیسا نہیں۔ اس کا خون تمھارے تلواروں کی پیاس بجھانے کے لیے ہے۔

جب بادشاہ کے خاص لشکری اپنی مہم پہ نکل پڑے تو۔ سرخ پہاڑوں کی نچلی وادیوں اور دریاؤں کے قریب جھونپڑیوں میں بسنے والے تمام لوگوں کے منہ کالے تھے۔ ان کی عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب منہ کالے کر کے اپنی جھونپڑی سے باہر آ کر حملہ آوروں کا انتظار کرنے لگے۔ دن کی تیز دھوپ اور گھٹن میں لشکریوں کے سردار اپنے سامنے کالے منہ والے لوگ دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ پھر منہ پہ سیاہی لگائے بوڑھوں نے سرداروں کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ تم سے پہلے کالے منہ والوں نے ہم سب کے منہ کالے کر کے ہمیں بادشاہ کے وفاداروں میں شامل کر دیا ہے۔ اب ہم میں کوئی ایسا نہیں۔ جو بادشاہ کی طاقت اور بادشاہ کے خداؤں کے خلاف ہو۔ ہم سب اپنے منہ کی کالک کے باعث بادشاہ کی مہربانیوں اور رحم کے مستحق ٹھہرا دیے گئے ہیں۔ چنانچہ جوشیلے لشکریوں نے اپنے ہانپتے ہوئے گھوڑوں کے منہ موڑ لیے اور دھول اُڑاتے ہوئے ان بستیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ جہاں انہیں اپنے سے بہت مختلف لوگوں کے خون بہانے تھے۔ اُسی شام سرخ پہاڑوں کی نچلی وادیوں کی بستیوں میں شام کی پھیلتے اندھیروں میں اچانک الاؤ روشن ہو گئے۔ نوجوان مردوں اور کنواریوں نے ناچتے ہوئے الاؤ کے گرد رقص اور نغموں کا جشن لگا دیئے۔ فضا میں دھوئیں اور بھنے ہوئے گوشت کی مہک نے ماحول میں اک مستی بھر دی۔ تو ایک لرزتی ہوئی آواز اندھیرے میں گونجی۔ ہمارا یہ جشن ہماری سلامتی اور زندگی کے لیے باعث برکت ہے۔ ہماری زندگی، آزادی اور ہماری زمین ان کنواریوں کی قربانیوں سے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ہاتھ کالک سے بھر کے بادشاہ کے ظالم اور وحشی درندوں دست اندازیوں کو روکنے میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ہماری زندگی ہماری کنواریوں کی قربانیوں سے دم ہے ہم اپنی بستیوں ان کنواریوں کے ناموں سے پکاردیں گے۔ جنھوں نے درندوں کے منہ کالے کرتے ہوئے اپنی عصمتیں اور جانیں گنوادیں۔ ہماری کنواریوں کے ہاتھوں پہ لگی ہوئی کالک آج بادشاہ کے ہر ظالم شخص

کے منہ پر چھٹ گئی۔

اُدھر غداروں کی بستیوں میں جب جشن کے نغمے گونجنے لگے تو بادشاہ کے محل میں کنیزوں اور ملکاؤں کے منہ بھی سیاہ ہونے لگے ۔ پھر ایک روز بادشاہ کی ایک ملکہ نے بہت سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا۔ تو بادشاہ غم اور غصے پہ قابو پانے کے لیے شراب کے حوض میں جا بیٹھا۔ اور بہت دیر تک سپاہیوں، مشیروں اور خداؤں کو گالیاں دیتا رہا۔ بادشاہ کے خاص مشیروں کو پہلے تو بادشاہ پہ سخت طیش آیا۔ اور وہ اُسے قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ لیکن سب جانتے تھے کہ ہر سازش ناگن کی طرح کئی سازشوں کو جنم دیتی ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر جب بادشاہ بے ہوش ہوا تو کسی نے اس کی خلوت گاہ میں گھس کر اس کے منہ سمیت سارے بدن کو کالک سے چپکا دیا۔ رات بھر بادشاہ اپنے بھیانک اور کالے منہ کو لیے گہری گہری آہیں بھرتے ہوئے بے سدھ لیٹا رہا۔ صبح جب بادشاہ کی چہیتی ملکہ خلوت گاہ سے باہر نکلی ۔ تو اس نے اپنے بال نوچ ڈالے اور سینہ پیٹتے ہوئے بولی اے غدارو، بے وفاؤ، بادشاہ کہاں، میرے خاوند کے بستر پہ لیٹا ہوا وہ ننگا، بدشکل آدمی کون ہے جو خون میں لت پت پڑا ہے۔ بادشاہ کے منہ کالا کرنے والا خاموشی میں بت بنے ملکہ کے سامنے کھڑے رہے۔ بہت سے لوگ اپنے اندر روحانی خوشی اور آزادی کے احساس میں چپ تھے لیکن کسی میں جرأت نہ تھی کہ وہ ملکہ سے یہ کہہ سکے کہ بدشکل اور بدشکل بھیانک ننگی سیاہ لاش بادشاہ سلامت کی ہے۔ چند وزیروں نے بادشاہ کی لاش اُٹھائی اور کئی دن تک غائب رہنے کے بعد جب وہ واپس اور دربار میں داخل ہوئے تو ان کے منہ ڈھل چکے تھے۔ ملکہ کو جب ان کی خبر ملی۔ تو اس نے ان سب کو قتل کروا دیا۔ پھر چند روز بعد اس نے اپنے کالے منہ والے اکلوتے بیٹے کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بیٹے کی بلوغت تک اس نے سلطنت کے سارے انتظامات اور کالے منہ والے کی نگرانی کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ دربار کے وزیروں اور سرداروں کے رُتبے اور ذمہ داریوں تبدیل کر دیں۔ پھر اس نے اپنے محل کے سب سے اونچی منزل پہ ایک سیاہ بالکنی بنوائی۔ اور صبح کو سفید اور شام کو سیاہ لباس پہن کر وہ بالکنی میں جا بیٹھتی اور محل کے چاروں طرف کے راستوں کو دیکھ دیکھ کر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کالے منہ والے پیشوا کی سکھائی ہوئی دُعاؤں کا ورد کرنے لگتی۔ ڈھنڈورچیوں نے پورے ملک میں اس بات کا چرچا کر رکھا تھا۔ کہ ملکہ اپنی وفا اور محبت میں بہت مضبوط اور سچی ہے۔ وہ صبح شام اپنے گم ہو جانے والے بادشاہ کی راہیں دیکھتی ہے اور اس کے انتظار میں دُکھ بھری دُعائیں کرتی رہتی ہیں۔ اُسے امید ہے کہ سرخ وسفید بادشاہ کسی روز گھوڑا دوڑاتا ہوا محل میں داخل ہو جائے گا۔

☆☆☆☆☆

سزا اور خدا

وہ ہمیشہ سے دین سے باغی تھا۔
اس کی مرحومہ والدہ نہایت ہی باپردہ اور پرہیزگار عورت تھی۔ وہ ہمیشہ اس کو نماز کی تلقین کرتی رہتی تھی لیکن اس کا پتھرایا دل ماں کی آواز پر لبیک کہنے سے کتراتا تھا۔ حالانکہ بچپن میں اسے مولوی عبداللہ کی صحبت میسر رہی لیکن مولوی صاحب کے اخلاق اس کی روح میں جذب نہ ہو سکے اور دیکھتے ہی دیکھتے گلیوں میں لڑکوں سے کھیل کھود میں لڑنے والا زاہد، شہر کا بدنام غنڈہ بن گیا۔ وہ صرف نام کا ہی زاہد تھا وگرنہ زہد و تقویٰ اسے چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔

وہ جب بھی نمازیوں کو مسجد سے نکلتے دیکھتا تو اس کے ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکراہٹ پھیل جاتی، اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ منافقت کی حدوں پر جی رہے ہیں، بظاہر ان کی زندگی میں خدا کے احکام کی کوئی تعمیل دکھائی نہیں دیتی لیکن پھر بھی سر پر ٹوپی سجا اور پائینچے اٹھا کر خدا کی خوشامد کے لیے پانچ وقت کی حاضری لگاتے ہیں۔ ان کی چہروں پر ایمان کا نور کہیں بھی نہیں جھلکتا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا چونکہ زمین و آسمان کا نور ہے اس لیے رب سے ملاقات یعنی نماز سے لوٹنے کے بعد نمازیوں کے چہروں پر خدا کے نور کی جھلک ضرور نظر آنی چاہیے۔ نمازیوں کے بے نور چہرے دیکھ کر اس کے گمان پر یقین کی مہر ثبت ہو جاتی کہ ان کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی لوگ اپنے سود آلود کاروبار کو بھاری تالا لگا کر نماز کو چلے آتے ہیں اور ان ہی میں سے کچھ نے تو مسجد کے عقب میں موجود دکانوں میں ویڈیو کی دکانیں سجا رکھیں تھیں جہاں پر ہندوانہ ثقافت کی فلمیں خواص و عوام کے لیے باآسانی میسر تھیں اور دکانوں کے دیواروں پر فحش فلموں کے پوسٹرز، صنفِ نازک کی نیم عریاں تصاویر لیے چسپاں تھے۔

پھر یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ بھی تو اسی آلودہ معاشرے کا، جس میں ہر انسان کے دو روپ ہیں، حصہ تھا۔ اس کی زندگی صوم و صلوٰۃ سے کہیں دور تھی۔ اسے نہیں یاد کہ اس نے آخری بار نماز کب اور کہاں پڑھی تھی۔ خدا کا نام بھی اس نے آخری بار اپنی والدہ کے جنازے میں یہ کہہ کر لیا تھا کہ ''اے

آفتاب محمود شمس

میرے اللہ، مجھے نماز جنازہ کی تکبیرات نہیں یاد، بس اتنی سی دعا ہے کہ میری والدہ کو جنت دے دے"۔ اس کی چوبیس گھنٹے کی زندگی گناہوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ منشیات فروشی سے لے کر آوارہ اور بدچلن عورتوں کی صحبت تک اس کی زندگی کا حصہ تھے۔ وہ شہر کے بدنام بھتہ خور گروہ کا سرغنہ تھا۔

محکمہ پولیس میں اس کی کافی جان پہچان تھی۔ متعدد بار وہ اپنے گھر سے گرفتار ہو چکا تھا لیکن اگلے ہی روز پولیس کی وگنی نفری اسے خود گھر چھوڑ جایا کرتی تھی۔ شاید اسی سے شہ پا کر وہ جرائم کی دنیا میں آگے نکل چکا تھا۔

شام زاہد کی زندگی میں قیامت خیز تھی، اس نے ایک ایسے قتل کا اقبال جرم کر لیا تھا جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق واسطہ تک نہ تھا۔ دراصل قتل اس کے دوست اصغر سے سرزد ہوا تھا، اس نے شکوک و شبہات کی بنیاد پر غصے کی حالت میں اپنی منگیتر کا قتل کر دیا تھا اور بھاگ کر زاہد کے ہاں پناہ لے لی تھی۔

زاہد نے اسے ڈیڑھ ماہ تک اپنے حجرے میں ٹھہرائے رکھا۔ اصغر چونکہ چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اس لیے وہ روزانہ زاہد کے آگے فریاد کرتا کہ کسی طرح اسے جیل جانے سے بچا لے۔ دوسری طرف زاہد گناہوں اور جرائم کی دنیا سے اکتا گیا تھا اور اصغر کے برعکس اس کے ماں باپ اور نہ ہی بہن بھائی تھے، شادی کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا، سو اس نے قریبی تھانے میں جا کر لڑکی کا قتل اپنے سر لے لیا۔

جیل کی پہلی رات نیند اس سے کوسوں دور تھی، اس کے ساتھ قید خانے میں دو اور بھی قیدی تھے جو خراٹے بھر رہے تھے۔ زاہد خیالوں میں کھویا ہوا تھا، اسے اپنا بچپن یاد آیا جب وہ دس سال کی عمر تک اپنی والدہ کے ساتھ سوتا تھا اور اس کی والدہ گھنٹوں تک اس کا سر سہلاتی رہتی تھی۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے وہ لاڈلا تھا، اس کے والدین اس کی ہر خواہش وقت سے پہلے پوری کر دیتے تھے۔ اس نے زندگی میں ہر عیش و آرام دیکھا تھا، لیکن اس کا دل پھر بھی بے چین اور مضطرب رہتا تھا اور آج اس کا یہ اضطراب اسے اس بند کوٹھڑی میں لے آیا تھا اور وہ سب کچھ تیاگ کر دنیا اور اس کے بکھیڑوں سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا تھا۔

اگلے دن ثروت (وہ طوائف جو اسے بہت پسند تھی) اس سے ملاقات کے لیے آئی۔ ثروت کو دیکھ کر زاہد نے اپنی نگاہیں فرش پر گاڑھ لیں اور اس کو سلام کیا۔ وہ ثروت کے تمام سوالات کا جواب مسکراہٹ بھرے انداز میں دیتا رہا۔ لیکن اس دوران اس نے ایک دفعہ بھی ثروت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ثروت نے جب اس سے پوچھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے تو زاہد

کا جواب سن کر ایک لمحے کے لیے وہ دم سادھے کھڑی رہی۔

اگلے دن زاہد کی خواہش کے مطابق ایک عدد جائے نماز، سفید ٹوپی اور تسبیح لے کر ثروت زاہد کے سامنے موجود تھی۔ آج بھی گفتگو کے دوران حسبِ معمول زاہد نے اپنی نگاہ نیچی رکھی۔

شب کے تین بج گئے اور زاہد باوضو ہو کر رب کے حضور دو رکعت نمازِ تہجد کی نیت کیے کھڑا تھا، وہ زاروقطار رویا، آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے دامن پر گر رہے تھے۔ اس نے اپنے تمام گناہوں پر خدا سے معافی مانگی اور خدا کو ہمیشہ کے لیے اپنا دوست بنا لیا۔ تہجد کی اس نماز نے زاہد کو وہ سکون بخشا جو وہ شراب و شباب میں ڈھونڈا کرتا تھا۔

زاہد پر قتل کا کیس قریباً ڈیڑھ سال تک چلتا رہا اور اس دوران زاہد روحانیت کی سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ اس نے جیل میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کی داڑھی چھاتی پر پھیلی ہوئی تھی اور زلفیں شانوں کو مس کر رہی تھیں۔ جیل میں رہتے ہوئے زاہد نے ایک بھی نماز قضا نہیں کی۔ جیل کے قیدیوں کو زاہد سے ایک خاص روحانی لگن ہو گئی تھی۔ پھر ایک دن آیا کہ جج نے زاہد پر فردِ جرم عائد کر کے اسے پھانسی کی سزا سنا دی۔ یہ خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور جیل کی فضا پر ایک افسردگی اور سکوت طاری ہو گیا۔

۲۳ جون ۲۰۱۴ کو صبح کی اذان کے بعد زاہد کو جیل کی راہداری سے ہوتے ہوئے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ وہ دھیمی چال چل رہا تھا، اس کی سیاہ زلفیں اس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں، اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے جیسے وہ زندگی کا بہترین مصرف کر کے جا رہا ہو، اس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھے اور پھر ۴ بجکر ۱۳ منٹ پر زاہد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

اصغر نے رسمی کاروائی کے بعد لاش وصول کر لی۔ زاہد کا چونکہ کوئی والی وارث نہ تھا اس لیے وہ زاہد کی لاش کو اپنے گھر لے گیا۔ لوگوں کا جمِ غفیر زاہد کے دیدار کے لیے آمو جود تھا، کیونکہ اس بات کا چرچا ہو چکا تھا کہ زاہد نے قتل نہیں کیا تھا اور فقط اصغر کو بچانے کے لیے زاہد نے اقبالِ جرم کیا تھا۔ زاہد کے لیے تمام نفرتیں اس کی قربانی دینے کی وجہ سے محبتوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ زاہد کو غسل دے کر کفنا دیا گیا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ زاہد کے چہرے پر نور کی بارش تھی وہی نور جسے کبھی وہ مسجد سے نکلتے نمازیوں کے چہروں پر ڈھونڈا کرتا تھا۔

☆☆☆☆

''شناسائی''

ہر طرف جدید تراش خراش میں ملبوس انگلش میڈیم لوگ موجود تھے۔ میں سادہ سے نیٹ کے سوٹ میں مس فٹ سی لگی۔ اپنے کاغذات کی فائل تھامے میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ ایک سرونٹ نے کوک کی بوتل پکڑا دی۔ شکر ہے سمجھدار لوگ ہیں۔ واقعی گرمی میں شدید پیاس لگ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ انٹرویو دینے والوں کی تعداد کم ہونے لگی۔

جلد ہی میرا نام پکارا گیا۔ لرزتا ہوا دل لیے میں آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ مہکتا ہوا شاندار آفس۔ ریوالونگ چیئر پر اِک حُسن کا مجسمہ سیاہ لباس میں ایستادہ تھا۔ شیراز! وہ دروازے کے درمیان میں ہی پتھر ہو گئی۔ ایک جھلک دیکھی تھی بس۔ میں پلٹ پڑی۔ سانسوں کو سنبھالتی میں تیزی سے باہر نکلی۔ ذرا سانس برابر ہوئی تو گیٹ کی جانب چل پڑی۔ دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں کو کیسے قابو کروں۔ آنسو تھے کہ مچل مچل کر باہر نکلنے کی راہ تلاش کر رہے تھے۔ یا خدایہ تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ میں اُس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ قدم بڑھتے گئے۔ دل دھڑک دھڑک کر تماشہ کر رہا تھا۔ عالیہ! چلتے ہوئے قدم رُک گئے۔ عالیہ رُکو پلیز۔ وہ قریب آ رہا تھا۔ مانو۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وقت نے جیسے پیروں سے لپٹ کر اُنہیں جکڑ لیا۔ اُس کے سانسوں کا شور میری پشت سے ٹکرایا۔

حُسن کا دیوتا۔ سیاہ لباس میں۔ میری آنکھیں زمین پر گڑیں تھیں۔ کیسے دیکھتی۔ پاگل نہ ہو جاتی۔ عالیہ۔ وہ عین میرے سامنے کھڑا ہوا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اُس آواز میں کیا تھا۔ یکدم ہی آنسوؤں کو راستہ مل گیا تھا۔ وہ گالوں سے پھسلنے لگے تھے۔ جب چاندی جیسی اُس کی ہتھیلی نے آنسوؤں کو روک لیا۔ چلو میرے ساتھ۔ اور میں کسی بے جان مورتی کی طرح اُس کے ساتھ چل پڑی۔ سارا سٹاف حیرت زدہ تھا۔ ملازم چکرائے ہوئے تھے۔ چوکیدار تو باقاعدہ پریشان ہو گیا تھا۔ ذیشان صاحب۔ یس سر۔ وہ انٹرویوز کا کام ذرا سنبھال لیں۔ میں بزی ہوں۔ یس سر۔ وہ مجھے لیے ہوئے ایک اور آفس میں داخل ہوا۔ شاندار آفس کے ٹھنڈے میٹھے ماحول میں اُس نے فریج سے جوس نکال کر گلاس

آسناتھ کنول

میں ڈالا- اور میرے آگے رکھ دیا-وہ سامنے موڈب سا کھڑا ہو گیا- پلیز عالیہ- ایک مرتبہ آنکھیں تو اوپر اُٹھاؤ- خدارا میرا امتحان مت لو- پتھر ہو چکا ہوں- ابھی ابھی تو پتہ چلا کہ زندہ انسان ہوں- پلیز- اور میں ساری عمر کے آنسو بہانے پر تلی بیٹھی تھی- اُسے دیکھا وہ ویسا ہی تھا- سُرخ وسفید- گھنی مونچھیں- شربتی آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں- ستواں ناک-اب قدرے فربہ مگر سمارٹ اور پہلے سے زیادہ شاندار- میں نے اُسے دیکھا- اُن آنکھوں میں بھی سمندر جھلکتے تھے- جو مجھے ڈبونے کو کافی تھے-

شیراز صاحب مجھے جانے دیں- میں اِس آفس کے لائق نہیں ہوں- عالیہ پلیز ایسا دوبارہ نہ کہنا - تمہارا آنا اور اچانک ملنا میری قسمت ہے- پچھلے دس سال سے اِس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں - میں نے حیرت سے اُسے دیکھا - مگر کیوں؟ میں نے استفسار کیا- نہیں جانتا وہ گویا ہوا اور پاس بیٹھ گیا- اُس کے وجود کے نرم احساس نے میرے کتنے زخم اُدھیڑ دیئے- درد بہنے لگا تھا- اُس کے کندھے پر سر رکھ کر میں کتنی ہی دیر ہچکیاں لیتی رہی- اُس نے سارے آنسو ٹشو میں سنبھال کر جیب میں رکھ لیے- یہ بہت قیمتی ہیں وہ بولا- بس دوبارہ نہیں بہنے چاہیے- بہت دیر ہو گئی ہے- اماں اکیلی ہیں اور بیمار بھی- مجھے جانا چاہیے پھر بتاؤں گی- زندگی نے میرے ساتھ کیا کیا-

ٹھیک ہے چلو آؤ- میں چلی جاؤں گی- اُس نے غور سے دیکھا -دوبارہ ایسا نہیں کہنا -وہ مُسکرایا- میں بھی صدیوں بعد مُسکرائی تھی- ایک شفاف اور اُجلی، بے داغ مُسکان- ڈرائیور نے ایک شاندار چمکتی ہوئی گاڑی نکالی تھی- چابی مجھے دے دو میں خود ڈرائیو کروں گا- یس سر- ڈرائیور سے چابی لے کر اُس نے گاڑی سٹارٹ کی- میں جھجکتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی- پھر اُسے راستہ بتاتی گئی- اور وہ ایک قدرے پرانی بستی کے ایک چھوٹے سے مکان پر جا رُکے- آتے ہوئے راستے میں میں پھل، دودھ اور بسکٹ وغیرہ لے آئی تھی-

اماں میں آ گئی ہوں- میں نے دروازہ کھولا- ماشااللہ- کیا بنا؟ وہ بستر میں بیٹھ چکی تھیں- اماں دیکھیں میرے ساتھ کون آیا ہے- میں نے لائٹ آن کی- اب اُنھیں قدرے کم نظر آتا تھا- مگر پہچان لیتی تھیں- لگتا ہے کہیں دیکھا ہے- پر یاد نہیں آ رہا- اماں جی میں شیراز احمد ہوں- آپ کو یاد ہے اپنا ہمسایہ شیراز احمد- ثمینہ بی بی کا بیٹا- احمد علی جو آپ کے ہمسائے تھے پچھلے گھر میں- ہائے صدقے جاؤاں- ذرا قریب تو آ- اماں نے اُس کے سر کو چوم لیا- میرا بچہ کیسا ہے تو- مدتوں بعد نظر آیا ہے- تو تو میرے بیٹے جیسا تھا- بھول ہی گیا ہمیں- اماں نے شکوہ کیا- اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے-

شیراز کا دل پسیج گیا- عالیہ اپنی آنکھیں صاف کرتی کچن میں چلی گئی- شیراز نے عالیہ سے ملنے اور یہاں تک آنے کی کہانی سُنا دی- بس بیٹا جب قسمت پلٹ جاتی ہے تو سب کچھ برباد ہو جاتا ہے- پھر اماں نے اُسے سارا کچھ من وعن سُنا دیا- وہ سُن سا بیٹھا یہ داستانِ غم سُنتا رہا- عالیہ چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر آئی- عالیہ یہ سب سُن کر میرا تو دل پھٹ

گیا۔ کیسے آپ لوگ اتنے دُکھ سہہ گئے۔ میں کوئی چھ ماہ پہلے اُس گھر میں آیا تھا۔ پتہ چلا کہ آپ لوگ وہاں سے جا چکے ہیں۔ کسی نے اتہ پتہ بھی نہیں دیا۔ بس یہ پتہ چلا کہ میاں میر چلے گئے ہیں۔ سوچا کسی دن فرصت سے ڈھونڈ لوں گا۔ مگر اتنی آفیشل مصروفیات سے وقت نہیں نکال پایا کہ اپنے طور پر کچھ مدد کرتا آپ لوگوں کی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ وہ واقعی بہت افسردہ تھا۔اماں جی اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو اپنے پہلے گھر جا کے رہنا ہے۔ مگر وہ تو ہم بیچ چکے ہیں۔ عالیہ نے دُکھ سے بتایا۔ کتنی یادیں جڑی تھیں اُس گھر سے۔ جانتا ہوں شیراز نے کہا۔ جب وہاں آیا تو مجھے گھر کے بکنے کی خبر ملی تھی۔ میں یہ کیسے ہونے دیتا۔ وہ عالیہ کا گھر تھا۔ میں نے دوبارہ عالیہ کے نام سے خرید لیا۔ عالیہ کے نام سے اماں نے حیرت سے پوچھا۔ جی اماں جی۔ عالیہ جو دس سال پہلے مجھ سے چھن گئی تھی۔ تب میں اُس کے قابل نہیں تھا۔ ورنہ روک لیتا۔ اے کاش مجھے پتہ ہوتا۔ تو کچھ بھی کر کے اپنی بیٹی کو برباد نہ ہونے دیتی۔ اماں جی ہر بات میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔

ستارہ سی آنکھوں میں دُکھ کی چمک تھی۔ مگر ایک اعتماد تھا، اِک یقین تھا۔ کچھ کرنے کا جذبہ تھا۔ اماں تو تڑپتی رہیں۔ وہ تو وقار جیسا ہی لگ رہا تھا۔ وقار جو کہیں کھو گیا تھا۔ اماں وہ کس ملک میں گیا تھا۔ پتہ نہیں بیٹے۔ شاید جرمنی گیا تھا۔ اماں میں اُس کا پتہ کراؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے۔ آپ کے دوسرے بیٹے کی ذمہ داری ہے۔ اماں نے کس کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے کبھی بھی چھوڑنا نہ چاہتی ہوں۔ کیا کھائیں گے میں جلدی سے بنا لیتی ہوں۔ اُسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں کہیں مُسکان اور خوشی تیرتی تھی۔ اتنا کچھ تو کھلا دیا۔ پیٹ بھر گیا۔ اب اِدھر آ کے بیٹھو اور مجھے بتاؤ۔ اب کیا ارادے ہیں۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اور اب دونوں نے دُکھی نہیں ہونا۔ ماں صدقے میرے بچے تم نے آ کر ہمیں نئی زندگی دے دی۔ مجھے بھی تو نئی زندگی مل ہے نا۔ اماں جی۔ اُس نے عالیہ کو دیکھا۔ وہ شرما ہی گئی۔

عجیب دُھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ وہ اُس کی آنکھوں کی روشنی میں لہریں لیتی تھی۔ اچھا چلو تم لوگ باتیں کرو میں تھک گئی ہوں۔ اب پرسکون ہوں اب تو میں آرام سے مر سکتی ہوں۔ اماں کیسی باتیں کرتی ہیں۔ عالیہ خفگی سے بولی۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ کل میں اور شہباز آئیں گے۔ آپ لوگوں کو آپ کے پرانے گھر منتقل کریں گے۔ شکریہ شیراز۔ وہ سامنے تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ واقعی تم میرے سامنے ہو۔ اِک خواب سا لگتا ہے۔ جیسے جاگوں گی تو سب غائب۔ ارے نہیں۔ مائی لیڈی (میری خاتون)۔ اُس نے عالیہ کے ہاتھ تھام لیے۔ اجازت ہے آپ کو یقین دلا دوں۔ اور پھر سانسوں کی مہکار اُس کے ہونٹوں پہ آ کر ٹھہر گئی۔ میں خوشی سے کہیں مر ہی نہ جاؤں۔ وہ بولی۔ نہیں میری جان اب تو ہمیں جینا ہے۔ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں گویا

ہوا۔ ان شاءاللہ۔ کل۔ وہ اشارہ کر کے تیزی سے نکل گیا۔ عالیہ کتنی ہی دیر گلی سے باہر اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

یا میرے اللہ تیری کیسی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ اِن دونوں کی ذمہ داری شیراز نے اُٹھالی تھی۔ وہ اپنے پہلے گھر میں واپس آئے۔ ہر خوشی غمی پہ آنسو بہانا لازمی تھا۔ اماں اپنے کمرے میں جا کر کتنی ہی دیر ابا کو یاد کرتی رہیں، بھائی کا غم کھاتی رہیں۔ میرے بارے اُنہیں تسلی ہوگئی تھی۔ اب تو شیراز کی ہر شام ہمارے ساتھ گذرتی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب آنٹی ثمینہ اور انکل احمد علی اپنے بچوں کے ساتھ اُس گھر میں آئے جو کبھی ہمارا تھا۔ مگر اب شیراز نے عالیہ کے نام کر دیا تھا۔ عالیہ نے ہلکے گلابی رنگ کا سیاہ کناری والا سوٹ پہنا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لمبے سیاہ بال کھلے تھے۔ آنکھوں میں کسی کے چہرے کی روشنی جگمگاتی تھی۔

سب نے چائے پی۔ کھانا کھایا۔ اور پھر ہیرے کی انگوٹھی سے عالیہ کو مانگ لیا۔ اماں تو بس اللہ کا شکر ہی کرتی رہیں۔ روتی رہیں۔ ایک ہفتے بعد ہی سادگی سے نکاح ہوگیا۔ البتہ شیراز نے فائیو سٹار ہوٹل میں ایک گرینڈ ریسپشن دیا تھا۔ چاند سورج کی جوڑی نے سب سے داد وصول کی۔

ہوٹل کے ایک کمرے کو ہی حجلہ عروسی بنایا گیا تھا۔ عالیہ اپنی قسمت کے اس پھیر پر حیران تھی۔ وہ اندر آیا تھا۔ تو میڈم دیکھا آپ نے قسمت یوں بھی پلٹ جاتی ہے۔ آپ ہماری قسمت میں لکھی تھیں۔ اِس لیے تو ہم نے کسی اور کو اِس دل میں آنے ہی نہیں دیا۔ وہ قریب آ گیا۔ بہت قریب۔ ستاروں نے اپنی کہکشاں کمرے میں اُتار دی تھی۔ قسمت بدل گئی تھی۔ حُسن کے دیوتا نے عشق کی دیوی کی مانگ اپنے ہونٹوں سے بھر دی تھی۔

سامنے دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں نئے کرایہ دار آ گئے تھے۔ روزانہ ہی کالج آتے جاتے دیکھتی کبھی کوئی آ رہا ہے کبھی کوئی جا رہا ہے۔ غالباً ماں باپ اور تین چار بچے تھے۔ میری چونکہ اِردگرد کے ماحول سے ہمیشہ ٹھنی رہی اِس لیے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ کون آتا کون جاتا ہے۔ صبح بھائی بائیک پہ کالج چھوڑ آتا۔ دوپہر کو ابا جان اپنے جنرل سٹور سے واپسی پر مجھے پک کر لیتے۔ یوں ایک چھوٹا سا پُرسکون گھرانہ بڑے آرام سے وقت گزار رہا تھا۔ مارکیٹ میں ابا کے جنرل سٹور کی اچھی خاصی آمدنی تھی۔ گھر کافی بڑا تھا اور اپنا تھا۔ گاڑی بھی تھی جو ابا کے زیر استعمال رہتی۔ کبھی کبھی ہم سارے اِس گاڑی پر رشتہ داروں کے ہاں بھی چلے جاتے۔ میری لمبی چوڑی دوستیاں بھی نہیں تھیں۔

گھر آ کر سارا وقت کچن میں گھسی رہتی۔ وہ میری پسندیدہ جگہ تھی۔ بہت دن گذر گئے۔ میری تو کوئی دعا سلام نہیں تھی۔ مگر اماں کے ساتھ سارے ہمسائیوں کی شناسائی تھی۔ سامنے والوں سے گپ شپ ہوگئی۔ سارے بچے پڑھتے تھے۔ ابا کسی فیکٹری میں کلرک تھے۔ آمدن بس کھینچ تان کر گذارہ تھا۔ خواہش تھی کہ بڑا لڑکا پڑھ لکھ کر کہیں کام پہ لگ جائے تو کچھ آسانی ہو جائے۔ بچارے اور ٹائم بھی

لگاتے کہ آمدن بڑھے۔ بیوی کپڑے سلائی کر لیتی تھی۔ اُس نے بھی نئے ہمسائیوں سے کام مانگنا شروع کر دیا۔ اور پھر ایک دن اماں کے پاس چلی آئیں۔ بتانے لگیں ساس نے ٹکنے نہ دیا تو مجبوراً کرائے کا گھر لینا پڑا۔ خیر اماں نے کافی حوصلہ دیا۔ ہمسائیوں سے بھی کہا کہ کپڑے سلائی کے لیے دیا کریں۔ یوں اُن کی مدد ہو جائے گی۔ اماں کبھی کبھی کچھ پکا ہوا کھانا بھی بھیج دیتی۔

وہ لوگ بڑے ہی مشکور رہتے۔ میں ہمیشہ ان سب باتوں سے لاتعلق ہی رہی۔ بس کالج، پڑھائی اور گھرداری۔ اسی طرح تقریباً چھ ماہ گذر گئے۔ ایک دن بھائی کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مجھے پیدل ہی سٹاپ پر جانا پڑا۔ اچانک وہ کہیں سے بائیک لے کر برآمد ہو گیا۔ آپ بُرا نہ منائیں تو میں ڈراپ کر دوں۔ میں نے کڑے تیوروں سے اُسے دیکھا۔ وہ تھوڑا سا گھبرا گیا۔

کیوں؟ میں نے سوال کر دیا۔

کیا میں پیدل نہیں چل سکتی۔ ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی۔ وہ میرے اس قدر روکھے رویے اور جواب سُن کر کان لپیٹ کر کک ماری اور یہ جا وہ جا۔

ہُن! بے وقوف۔ بڑا آیا ہیرو بننے۔

اسی طنطنے میں میں نے اُس کا اجمالی جائزہ بھی لے لیا تھا۔ اتنا بُرا نہیں تھا۔ سمارٹ تھا۔ آنکھیں شربتی۔ اور پلکیں جھکی ہوئی نمایاں تھیں۔ مگر۔ میں۔ ہُن۔ اِس سے آگے کچھ نہیں۔ کچھ عرصہ تو موصوف نظر ہی نہ آئے۔

دوسری مرتبہ میں ہمسائی کے گھر جانے کے لیے نکلی تھی جب وہ اپنے چھوٹے سے گیٹ سے کھٹارا سی بائیک نکالنے کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ باقی بچے اُس کی مدد کر رہے تھے۔ بے وقوف کہیں کا بڑا گیٹ کھول لیتا۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ اُس نے مُڑ کر شرمندہ سی نگاہوں سے دیکھا۔ بلیک شرٹ میں وہ کافی اچھا دکھ رہا تھا۔ اُس کے باپ کی چھٹی والے دن ابا سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ابا نے اُنھیں آمدنی بڑھانے کے نسخے بتائے۔ کہا کہ شام کو اور ٹائم کی بجائے اُن کے جنرل سٹور پر آ جایا کریں۔ چھٹی والے دن بھی کام کر لیا کریں تو آمدن بڑھ جائے گی۔ یوں وہ ابا کے بے حد ممنون ہوئے۔ واقعی اُن کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو گھر میں نیا سیکنڈ ہینڈ بائیک نظر آنے لگا۔

میں ویسے تو گھر سے کم ہی نکلتی تھی۔ ایک دن اماں نے بتایا کہ نصرت کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم کچھ پکا کر دے آؤ۔ میں دے آؤں۔ میں زور سے چیخی۔ میں ایسے کام نہیں کرتی۔ چلو کچھ پکا دیتی ہوں۔ خود دے آنا اماں۔ میں نے کوفتے پکائے ہوئے تھے۔ ساتھ کچھ پھلکے بنائے۔ اچار رکھا تو دیکھا اماں ایک اور ہمسائی سے زمانے کے بگڑتے حالات پر محوِ گفتگو تھیں۔ اماں بھی بس۔ ہر ایک کا درد بانٹنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میں جھنجھلا گئی۔ روٹیاں جھاڑن میں رکھیں۔ ڈبے میں سالن اور اچار ڈالا اور دوپٹہ اوڑھ کر جا دروازے پہ کھڑی ہوئی۔ نصرت نے دروازہ کھولا۔ تم نصرت ہی ہو نا۔ جی باجی۔ امی کدھر ہیں۔ وہ اندر کمرے میں ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں کمرے میں چلی آئی۔ آنٹی بستر پر لیٹی تھیں۔ اماں نے بتایا کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔

کیسی طبیعت ہے اب۔ کوئی دوائی وغیرہ لی۔ اماں نے کھانا بھجا ہے۔

بہت شکریہ بیٹی! وہ دعائیں دینے لگیں۔ میں نے جلدی سے دہلیز پار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب سیاہ شلوار قمیض میں دمکتے ہوئے بندے سے ٹکرائی اور پھر تیزی سے اپنی دہلیز پار کر گئی۔ یا اللہ اس بندے کے کالے سوٹ سے مجھے بچالے۔ اُسے خود پہ ہنسی بھی آئی۔ کمال ہی ہو گیا۔ اُس کو کہاں سے پتہ چل گیا کہ کالا رنگ مجھے پسند ہے اور اُسے اچھا لگتا ہے۔ سوچوں میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے الیف ایس سی کر لی تھی۔ ماں باپ نے کہا کافی ہے۔ اب تمہاری شادی کر دیتے ہیں۔ مگر مجھے ابھی اور پڑھنا تھا۔ اسی دوران ایک دُور کی پھپھو اپنے انجینئر بیٹے کے لیے رشتہ لے کر آ گئیں۔ اچھا خاصا مرد نظر آ رہا تھا۔ مگر گھر والے خوش تھے۔ کہ اچھا رشتہ مل گیا ہے۔ میں بھی بھلا کیا کہتی۔ اچانک ہی کہیں سے کالا سوٹ آنکھوں کے آگے لہرایا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ذہن کو جھٹک دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ تو کیا میں اُسے پسند کرنے لگی ہوں۔ جس کا نام بھی مجھے پتہ نہیں۔ ہمسائیوں کو بھی سن گن لگ گئی تھی۔ شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ بھائی گاڑی لیے انتظار کر رہا تھا۔ اماں بھی آ گئیں۔

وہ باہر ہی کھڑا تھا۔ اُنہیں حسین شربتی آنکھوں نے سر سے پاؤں تک مجھے گھورا۔ دل ڈول گیا تھا میرا۔ ظالم کے بچے تم میری قسمت نہیں ہو۔ یوں لگا جیسے اُس نے یہ سُن لیا ہو۔ اُس کے چہرے پر سارے جہان کا دُکھ جھلکنے لگا۔ آج تو وہ آگے پیچھے بھی نہیں ہوا، سامنے ڈٹ کر کھڑا رہا۔ بھائی کے ساتھ ہیلو ہائے کیا۔ اور کالے سوٹ میں دمکتا چہرہ لیے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ اتنی جلدی کوئی کیسے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ دُکھ کی ایک کٹار میرے دل میں گڑ گئی۔ کچھ کھو جانے کا احساس ہوا۔ کاش تم اس قابل ہوتے کہ مجھے مانگ سکتے۔ اک افسوس میرے سارے وجود میں گھل گیا۔ دل بے کلی کا شکار ہوا۔ بے دلی سے شاپنگ کی۔ اب تو اکثر میں کھڑکی سے باہر جھانکتی مگر وہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ عجیب ٹیلی پیتھی کا سسٹم تھا۔ شاید اُسے پتہ چل گیا تھا کہ وقت اپنی چال چل گیا ہے۔

آج کل میرے دل کو کسی چیز نے دبوچ رکھا تھا۔ وہ اب کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد آج کپڑوں کی سلائی کا پتہ کرنے گئی تھی۔ وہ گھر پہ نہیں تھا۔ تم اتنی اچھی اور نیک بچی ہو۔ اللہ نے رشتہ بھی بہت شاندار بھیجا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ دیکھو میں نے کتنے پیار سے سب کچھ بنایا ہے۔ شہزادی لگو گی۔ ایک پھیکی سی مُسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی تھی۔ بچے کدھر ہیں۔ وہ قرآن پاک پڑھنے گئے ہیں۔ اور شیراز کا آج بی ایس سی کا آخری پرچہ ہے۔ میں تو کہتی ہوں اب کوئی کام کر لو۔ مگر اُسے پڑھنے کا شوق ہے۔ باپ بھی کہتا ہے کہ پڑھ لو۔ اچھی نوکری ملے گی۔ جی آنٹی۔ علم کی اپنی اہمیت ہے۔ میں بھی شادی کے بعد پڑھائی جاری رکھوں گی۔ میں تو پڑھنا چاہتی تھی مگر ماں باپ نہیں مانتے۔ بھائی بھی باہر جانا چاہتا ہے۔ اس لیے۔ اچھا چلو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اُنھوں نے دُعا دی۔ آج پھر گیٹ پر ہی تھی۔ جب وہ اندر آیا۔

آپ خوش ہیں۔ اچانک اُس نے کہا۔ میرے منہ سے نکلا۔ جی۔ اُس کے چہرے کی ساری روشنی کسی

نامعلوم سیاہی میں ڈھل گئی۔ آنکھوں کی چمکتی قندیلیں بجھ گئیں۔ اب تو دل تھا جو بے کار دھواں دیتا تھا۔ میری قسمت۔ بس یہی لفظ نکلے تھے۔ گلا رندھ گیا۔ پتہ نہیں میں اُسے اور کیا کہنا چاہتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ یہ غم سے بھرا دل اُس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ مگر مجھے اَنا عزیز تھی۔ لہٰذا اَن کہی سے دل کو بہلانے لگی۔

منگنی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مگر ایک مصنوعی سی خوشی چہرے پہ سجائے میں کسی گہرے افسوس میں گم تھی۔ دن آتے رہے، جاتے رہے۔ میری اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اب تو دانستہ میں بھی اپنے کمرے سے باہر نہیں جاتی تھی۔ کسی دوسرے شخص سے منسوب ہوں۔ میں نے کوئی احتجاج بھی نہیں کیا تھا۔ کسی سے محبت کا دعویٰ بھی نہیں۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟ مجھے خود بھی سمجھ نہ آتی تھی۔ میں نے سارے خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور کاموں میں لگ گئی۔ خود کو اور زیادہ مصروف رکھنے لگی۔ کوشش کرتی کہ اُسے ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش کو دل میں دفن کر دوں۔

شادی کا دن بھی آ گیا۔ شادی ہال میں ہمسائے بھی مدعو تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح سیاہ سوٹ میں ملبوس بھائی کے ساتھ شادی کے انتظامات کو دیکھ رہا تھا۔ رخصتی کے وقت وہ اچانک ہی کہیں سے نکل کر آگے آیا۔ چشم بددور۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ دُور کہیں دُکھ کے سمندر آنکھوں میں چمکتے تھے۔ جیتی رہیں۔ اُس نے حسرت سے آہ بھری۔ اور پھر وہ نظر نہیں آیا۔ میں مظفر گڑھ آ گئی تھی۔ گھر بھی شاندار، سسرال کا کاروبار بھی، یہاں کا آفس بھی۔ سب کچھ ایک سے بڑھ کر ایک۔ سسرال کا سارا خاندان قریب قریب ہی آباد تھا۔ مجھے سر آنکھوں پہ بٹھایا گیا۔ میں بھی خوش رہنے کی کوشش کرتی۔ ظفر کی محبت نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔

میں نے آگے پڑھنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ مان لی گئی۔ میں نے پرائیویٹ بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ کام ہی کتنا تھا آخر۔ ملازم بھی تھے۔ ساس بھی کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں۔ مجھے بھی جو کام ملتا کر لیتی۔ وقت گذرنے لگا۔ تقریباً۔ چھ ماہ بعد گھر کا چکر لگا تھا۔ ہمسایوں کی خیر لی۔ شیراز کہیں نظر نہیں آیا۔ دو دن رہ کر میں واپس آ گئی۔ اک کسک سی کتنے ہی دن دل کو کچوکے لگاتی رہی۔ اماں سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ پتہ چلا بھائی نے ایم بی اے کر لیا ہے۔ باہر جانے کی دُھن اُس پر سوار تھی۔ کچھ دوستوں سے مل ملا کر اُس نے باہر کسی کمپنی میں چھوٹی موٹی جاب کا بندوبست کر لیا تھا۔

ابا کے پاس ایک پلاٹ موجود تھا۔ وہ بیچ کر اُس کے باہر کے اخراجات پورے کیے۔ یوں وہ ماں باپ کو اُن کے اپنے سہارے چھوڑ کر اپنا مستقبل بنانے یورپ کو نکل گیا۔ میں کچھ دن ماں باپ کے پاس رہنے اور اُن کو سہارا دینے آ گئی۔ بہت دل چاہتا کہ شیراز کا پتہ کروں۔ ایک نظر اُسے دیکھ لوں۔ مگر پھر سختی سے خود کو روکا۔ اب میں شادی شدہ ایک گھریلو عورت ہوں۔ اِس طرح کی خواہش کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا۔ میں بھی آخر کب تک ماں باپ کے پاس رہ سکتی تھی۔ مجھے سسرال واپس جانا تھا۔ ہمسائی آنٹی سے فرمائش کی کہ وہ اماں کا خیال رکھا کریں۔

وقت زقندیں بھرنے لگا۔ میں نے بی اے کر لیا تھا مگر شادی کے تین سال بعد بھی میں خالی گود لیے

ہوئے تھی۔ گھر میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ بچہ ہونا چاہیے۔ علاج شروع ہوا تو سارے ٹیسٹ کروائے گئے۔ ڈاکٹروں نے ہم دونوں کو صحت مند قرار دے دیا۔ تسلی کے لیے کچھ ادویات بھی دے دیں۔ مگر ایک اور سال انتظار کی نظر ہوا۔ میں خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ جیسے اِس میں میرا ہی قصور تھا۔ گھر میں دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ ظفر بھی راضی ہو چکے تھے۔ مجھ سے رسمی سی گفتگو ہوئی تھی۔ شادی کی اجازت درکار تھی۔ میرا بھلا کیا زور چلتا تھا۔ میں نے ہاں کہہ دی۔ میری ساس بڑی خوش تھی۔ وہ کہاں دیکھ سکتی تھی کہ مجھ پہ کیا گذری تھی۔ کوئی عورت بھی سوتن برداشت نہیں کرتی۔ مگر تقدیرِ الٰہی یہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ مجھے شوہر کی دوسری شادی کا صدمہ سہنا پڑتا۔ ایک اور سانحہ میرا منتظر تھا۔

والدین تو اکیلے ہی اتنے بڑے گھر میں رہتے تھے۔ ایک دن شارٹ سرکٹ سے جنرل سٹور میں آگ لگ گئی تھی۔ دُکان میں کوئی تھا بھی نہیں۔ جب تک لوگ مدد کو دوڑتے۔ ساری دُکان جل کر راکھ ہوگئی۔ اِردگرد کی دُکانوں کو بھی نقصان پہنچا۔ اور میرے والد صاحب کو تو لاکھوں کے مال کا یوں جل جانا دل پہ لگ گیا۔ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اُنھیں ہسپتال لے جانا پڑا۔ کوئی چیز بھی نہیں بچی تھی۔ میں پہلی کال پر ہی بدحواس سی بھاگی چلی آئی۔ ماں باپ کے اتنے بڑے غم کو سینے میں لیے اُن کی مدد کرنے لگی۔ اپنا دُکھ اُنہیں بتا کر مزید دُکھی نہیں کر سکتی تھی۔ بھائی کو کئی فون کیے مگر وہ تو باہر جا کر نجانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ کوئی خبر ہی نہ لی۔

والد صاحب ایک ہفتہ ہسپتال میں رہے۔ بینک میں جو کچھ تھا۔ سب علاج پہ لگ گیا۔ اِس صدمے نے ماں کو گردوں کی مریض بنا دیا۔ اور میں بس بھاگی پھرتی کہ بس دونوں بچے رہیں۔ ماں نے واپس جانے کا کہا۔ تو میں نے جانے کا انکار کر دیا۔ ماں باپ کے اصرار پر مجھے اُنھیں بتانا پڑا کہ کیا مسئلہ تھا۔ والد صاحب کو مزید چُپ لگ گئی۔ ہسپتالوں کے اخراجات اتنے بڑھ گئے تھے پھر مہنگی ادویات۔ پیسے تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ اَبا ایک دن آہستہ آہستہ چل کر ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس گئے اور اُجڑی ہوئی دُکان بیچ دی۔ کچھ عرصہ مزید آگے بڑھ گیا۔ میں افسوس کے دوراہے پہ کھڑی ہمیشہ کسی ہمدرد کی منتظر رہی۔ دل اتنا خالی تھا کہ ویرانی بھی ڈرتی تھی۔ ماں باپ کے سامنے ہمیشہ بہادری کا لبادہ اوڑھے رکھتی۔ اِن بزرگوں کو اپنے دل کے زخم کیسے دکھاتی۔ کہ وہ تو پہلے ہی صدموں سے اَدھ موئے ہو چکے تھے۔ اِک سوگواری ہر وقت ماحول کو گھیرے رکھتی۔ اکثر جب میں مایوس ہونے لگتی تو کہیں سے چمکتی ہوئی دو آنکھیں سیاہ لبادے میں جھلک دکھا جاتی۔ اور میں قسمت کے پھیر پر حیران ہوتی رہتی۔ کیسے ہاتھ میں آ کے سب کچھ کھو گیا تھا۔

عالیہ بیٹے ایک بات کرنی تھی۔ جی اَبا جی۔ بولیں۔ میں نے کچن سے ہی آواز دی۔ میرا خیال ہے کہ اتنے بڑے گھر کی ہمیں ضرورت نہیں۔ دو بوڑھوں کو اب ایک کمرے کی ضرورت ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اِسے بیچ کر کوئی دو کمروں کا چھوٹا گھر لیتے ہیں۔ چلو کوئی چار پیسے اور بچ جائیں گے۔ تو تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ اور ہماری تو اتنی ضرورتیں

اب رہی نہیں۔ ابا کی اس بات نے دل کاٹ کے رکھ دیا۔ اماں تو دُور تخت پوش پر لیٹی رونے لگیں۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ جس گھر میں اتنے اچھے دن دیکھے تھے۔ وہ ہم پہ بھاری ہو گیا تھا۔ مگر حقیقت تو یہی تھی۔ کہ مزید پیسوں کا بندوبست کہاں سے کرتے۔ دل کٹ کٹ جاتا جب لوگ روز گھر دیکھنے آتے۔ اماں تو بالکل پلنگ سے لگ گئیں۔ ابا بھی اُداس اُداس سے گھومتے جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ مگر کبھی کچھ نہ کہتے۔ بس حوصلہ دیتے رہتے۔

پھر ایک دن وہ گھر بیچ کر دو کمروں کے ایک چھوٹے سے گھر میں اُٹھ آئے۔ آنکھیں برسات بنی رہیں۔ دل خاک ہوتے رہے۔ مگر ضرورتیں ہمارے جذبات کو نہیں دیکھتیں۔ مجھے آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا جب ڈاک کے ذریعے ایک لفافہ ملا۔ جس میں طلاق نامے کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ کا چیک بھی تھا۔ ظفر نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ خبر ہم سب پر بجلی بن کر گری۔ دوسری شادی کر لیتا طلاق تو نہ دیتا۔ دُنیا اندھیر کر کے رکھ دی۔ ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تو وہ ہسپتال کے ہو کر رہ گئے۔ اماں کی گردوں کی تکلیف نے ہر تکلیف کو پیچھے چھوڑ دیا۔ میں اپنے دُکھ اور غم بھول کر اماں ابا کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ ایک مہینے کی بھاگ دوڑ کے باوجود ابا جانبر نہ ہو سکے۔ میں اور اماں رونے کو اکیلے رہ گئے۔ میری اُجاڑ زندگی اور صورت دیکھ کر اماں ظفر کے لیے بددعاؤں کا ٹوکرا سامنے رکھ لیتیں۔

بُری طرح بکھرے ہوؤں کو کون سمیٹتا۔ بھائی کی کچھ خبر نہیں تھی۔ دوستوں یاروں سے بھی پتہ کروایا۔ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ یہ ایک اور بڑے دُکھ اور صدمے کی بات تھی۔ ماں کی آنکھیں خلاؤں میں کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈتی رہتی۔ میں نے ایک مقامی سکول میں نوکری کر لی۔ دل بھی بہلا اور کچھ پیسے بھی آنے لگے۔ محلے والے بھی ہر ممکن دلجوئی کرتے۔

ماں کے سہارے میں بھی جیے جاتی تھی۔ ساتھ میں پرائیویٹ ایم اے بھی کر لیا۔ ماں کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ بس جیسے دونوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اماں اب میرے بارے میں ہی سوچتی رہتی۔ عالی پُتر۔ تیرا کیا بنے گا۔ میرے مرنے کے بعد تو بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی شریف آدمی سے نکاح کر لے۔ مجھے بھی سکون مل جائے گا۔

چھوڑ دو ماں۔ کوئی اور بات کرو۔ بس اِک شبیہ سی آنکھوں سے ہو کر دل میں اُتری تھی۔ بس ماں ٹھیک ہوں میں تو فکر نہ کر جیسی اللہ کی مرضی ہوئی گذر جائے گی۔ اتنے بڑے بڑے صدمے ہم سہہ گئے ہیں۔ اب تو دُکھوں کے ہم عادی ہو گئے ہیں۔ ایک حزن آمیز مُسکراہٹ اُداس چہرے پر بکھری۔ صدمے تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

اچانک ہی پتہ چلا کہ کرونا وائرس نے حملہ کر دیا۔ سکول بند ہو گئے۔ تنخواہ ملنا بند ہو گئی۔ عملاً میں بے کار ہو گئی تھی۔ پس انداز کیے ہوئے پیسوں سے تین چار مہینے تو گذر گئے۔ ماں کا علاج بھی جاری تھا۔ نوکری کی ضرورت تھی۔ سارا دن حالات مایوسی کا شکار کیے رکھتے۔ ایک دو جگہوں پر چھوٹی چھوٹی نوکریاں کیں مگر بات نہ بنی۔

چھ ماہ گذر گئے۔ حالات کچھ بہتر ہونے لگے تھے۔ روز اخبار میں اشتہار دیکھتی۔ اِک نئی اُمید کے ساتھ کسی نوکری کا انتظار کرتی۔ کرونا کے بعد کچھ بہتری آنے لگی تو کاروبار کھلنے لگے۔ اتوار کا دن تھا۔ ہاکر سے اخبار لے آئی۔ ماں کو ناشتہ دے کر وہ اخبار دیکھنے لگی۔ سارے اشتہار پڑھتی چلی گئی۔ اچانک ایک اشتہار پر نظر ٹک گئی۔

ملٹی نیشنل کمپنی کو کچھ عہدوں کے لیے ضرورت تھی گریجوایٹس کی۔ میں نے بھی آن لائن درخواست دے دی۔ کچھ ہی دنوں میں کال آ گئی۔ اماں دعا کرو۔ آج انٹرویو ہے۔ کامیاب ہو جاؤں تو اچھے پیسوں کی نوکری مل جائے گی۔ پھر تیری دیکھ بھال کے لیے کسی خاتون سے کہہ دوں گی۔ ماں اِسی لیے پڑھائی کی تھی کہ کسی کام آئے۔ ویسے بھی اب اِس کے علاوہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آہ! یہ تو ہے۔ اماں کے لبوں سے اِک سرد آہ پھسلی۔ آنسو تو پینے کو تیار رہتے تھے۔

اللہ کامیاب کرے۔ آمین۔ اُس نے بہت عرصے بعد ایک پرانا نیٹ کا سوٹ نکالا۔ پتہ نہیں کیوں؟ کہیں سے ایک سیاہ سوٹ کی جھلک آنکھوں میں لہرائی تھی۔ بالوں کو کھلا چھوڑ کر ہلکی سی پن لگائی۔ ہلکا سا میک اپ کیا کہ اتنی بڑی کمپنی میں ذرا مناسب نظر آنا چاہیے۔ اماں! ٹھیک لگ رہی ہوں۔ میں نے طائرانہ نظر سے اپنا جائزہ لیا۔ ماشا اللہ! اماں نے جلدی سے خاک کا ٹیکہ لگایا۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ میری اتنی سوہنی بیٹی کے نصیب کیوں اتنے سوہنے نہیں ہوئے۔ آنکھیں برس پڑیں۔ اماں! جیسی قسمت لکھ دی گئی ہے کیا ہو سکتا ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ جلد آ جاؤں گی۔

میں نے گلی کی نکڑ سے رکشہ لیا اور اس جدید علاقے کے شاندار آفس میں پہنچ گئی۔ ہر چیز سے دولت کی فراوانی ٹپک رہی تھی۔ مجھ سے پہلے کوئی 50-60 لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ رکشے والے کو پیسے دے کر میں اندر گئی۔ میرے پاس آفس کا لیٹر موجود تھا وہ ایک صاحب کو جمع کروایا۔ اور ایک بڑے ہال میں داخل ہوئی۔ جہاں ہر طرف شاندار صوفے لگے تھے۔ اَن پر ہر طرف جدید تراش خراش میں ملبوس انگلش میڈیم لوگ موجود تھے۔ میں سادہ سے نیٹ کے سوٹ میں مس فٹ سی لگی۔ اپنے کاغذات کی فائل تھامے میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ ایک سرونٹ نے کوک کی بوتل پکڑا دی۔ شکر ہے سمجھدار لوگ ہیں۔ واقعی گرمی میں شدید پیاس لگ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ انٹرویو دینے والوں کی تعداد کم ہونے لگی۔

جلد ہی میرا نام پکارا گیا۔ لرزتا ہوا دل لیے میں آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ مہکتا ہوا شاندار آفس۔ ریوالونگ چیئر پر اِک حُسن کا مجسمہ سیاہ لباس میں ایستادہ تھا۔ شیراز! وہ دروازے کے درمیان میں ہی پتھر ہو گئی۔ ایک جھلک دیکھی تھی بس۔ میں پلٹ پڑی۔ سانسوں کو سنبھالتی میں تیزی سے باہر نکلی۔ ذرا سانس برابر ہوئی تو گیٹ کی جانب چل پڑی۔ دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں کو کیسے قابو کروں۔ آنسو تھے کہ مچل مچل کر باہر نکلنے کی راہ تلاش کر رہے تھے۔ یا خدایہ تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ میں اُس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ قدم بڑھتے گئے۔ دل دھڑک دھڑک کر تماشہ کر رہا

تھا۔ عالیہ! چلتے ہوئے قدم رُک گئے۔ عالیہ رُکو پلیز۔ وہ قریب آ رہا تھا۔ مانو۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وقت نے جیسے پیروں سے لپٹ کر انہیں جکڑ لیا۔ اُس کے سانسوں کا شور میری پشت سے ٹکرایا۔

حُسن کا دیوتا۔ سیاہ لباس میں۔ میری آنکھیں زمین پر گڑیں تھیں۔ کیسے دیکھتی۔ پاگل نہ ہو جاتی۔ عالیہ۔ وہ عین میرے سامنے کھڑا ہوا۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اُس آواز میں کیا تھا۔ یکدم ہی آنسوؤں کو راستہ مل گیا تھا۔ وہ گالوں سے پھسلنے لگے تھے۔ جب چاندی جیسی اُس کی ہتھیلی نے آنسوؤں کو روک لیا۔ چلو میرے ساتھ۔ اور میں کسی بے جان مورتی کی طرح اُس کے ساتھ چل پڑی۔ سارا سٹاف حیرت زدہ تھا۔ ملازم چکرائے ہوئے تھے۔ چوکیدار تو باقاعدہ پریشان ہو گیا تھا۔ ذیشان صاحب۔ یس سر۔ وہ انٹرویوز کا کام ذرا سنبھال لیں۔ میں بزی ہوں۔ یس سر۔ وہ مجھے لیے ہوئے ایک اور آفس میں داخل ہوا۔ شاندار آفس کے ٹھنڈے میٹھے ماحول میں اُس نے فریج سے جوس نکال کر گلاس میں ڈالا۔ اور میرے آگے رکھ دیا۔ وہ سامنے مؤدب سا کھڑا ہو گیا۔ پلیز عالیہ۔ ایک مرتبہ آنکھیں تو اوپر اُٹھاؤ۔ خدارا میرا امتحان مت لو۔ پتھر ہو چکا ہوں۔ ابھی ابھی تو پتہ چلا کہ زندہ انسان ہوں۔ پلیز۔ اور میں ساری عمر کے آنسو بہانے پر تلی بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھا وہ ویسا ہی تھا۔ سُرخ و سفید۔ گھنی مونچھیں۔ شرمتی آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں۔ ستواں ناک۔ اب قدرے فربہ مگر سمارٹ اور پہلے سے زیادہ شاندار۔ میں نے اُسے دیکھا۔ اُن آنکھوں میں بھی سمندر جھلکتے تھے۔ جو مجھے ڈبونے کو کافی تھے۔

شیراز صاحب مجھے جانے دیں۔ میں اِس آفس کے لائق نہیں ہوں۔ عالیہ پلیز ایسا دوبارہ نہ کہنا۔ تمہارا آنا اور اچانک ملنا میری قسمت ہے۔ پچھلے دس سال سے اِس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ مگر کیوں؟ میں نے استفسار کیا۔ نہیں جانتا وہ گویا ہوا اور پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے وجود کے نرم احساس نے میرے کتنے زخم اُدھیڑ دیئے۔ درد بہنے لگا تھا۔ اُس کے کندھے پر سر رکھ کر میں کتنی ہی دیر ہچکیاں لیتی رہی۔ اُس نے سارے آنسو ٹشو میں سنبھال کر جیب میں رکھ لیے۔ یہ بہت قیمتی ہیں وہ بولا۔ بس دوبارہ نہیں بہنے چاہیے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اماں اکیلی ہیں اور بیمار بھی۔ مجھے جانا چاہیے پھر بتاؤں گی۔ زندگی نے میرے ساتھ کیا کیا۔

ٹھیک ہے چلو آؤ۔ میں چلی جاؤں گی۔ اُس نے غور سے دیکھا۔ دوبارہ ایسا نہیں کہنا۔ وہ مُسکرایا۔ میں بھی صدیوں بعد مُسکرائی تھی۔ ایک شفاف اور اُجلی، بے داغ مُسکان۔ ڈرائیور نے ایک شاندار چمکتی ہوئی گاڑی نکالی تھی۔ چابی مجھے دے دو میں خود ڈرائیو کروں گا۔ یس سر۔ ڈرائیور سے چابی لے کر اُس نے گاڑی سٹارٹ کی۔ میں جھجکتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر اُسے راستہ بتاتی گئی۔ اور وہ ایک قدرے پرانی بستی کے ایک چھوٹے سے مکان پر جا رُکے۔ آتے ہوئے راستے میں میں پھل، دودھ اور بسکٹ وغیرہ لے آئی تھی۔

اماں میں آ گئی ہوں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ماشاءاللہ۔ کیا بنا؟ وہ بستر میں بیٹھ چکی تھیں۔

اماں دیکھیں میرے ساتھ کون آیا ہے۔ میں نے لائٹ آن کی۔ اب اُنھیں قدرے کم نظر آتا تھا۔ مگر پہچان لیتی تھیں۔ لگتا ہے کہیں دیکھا ہے۔ پر یاد نہیں آ رہا۔ اماں جی میں شیراز احمد ہوں۔ آپ کو یاد ہے اپنا ہمسایہ شیراز احمد۔ ثمینہ بی بی کا بیٹا۔ احمد علی جو آپ کے ہمسائے تھے پچھلے گھر میں۔ ہائے صدقے جاواں۔ ذرا قریب تو آ۔ اماں نے اُس کے سر کو چوم لیا۔ میرا بچہ کیسا ہے تو۔ مدتوں بعد نظر آیا ہے۔ تو تو میرے بیٹے جیسا تھا۔ بھول ہی گیا ہمیں۔ اماں نے شکوہ کیا۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

شیراز کا دل پسیج گیا۔ عالیہ اپنی آنکھیں صاف کرتی کچن میں چلی گئی۔ شیراز نے عالیہ سے ملنے اور یہاں تک آنے کی کہانی سُنا دی۔ بس بیٹا جب قسمت پلٹ جاتی ہے تو سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ پھر اماں نے اُسے سارا قصہ من وعن سُنا دیا۔ وہ گم صم بیٹھا یہ داستانِ غم سنتا رہا۔ عالیہ چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر آئی۔ عالیہ یہ سب سُن کر میرا تو دل پھٹ گیا۔ کیسے آپ لوگ اتنے دُکھ سہہ گئے۔ میں کوئی چھ ماہ پہلے اُس گھر میں آیا تھا۔ پتہ چلا کہ آپ لوگ وہاں سے جا چکے ہیں۔ کسی نے اتہ پتہ بھی نہیں دیا۔ بس یہ پتہ چلا کہ میاں میر چلے گئے ہیں۔ سوچا کسی دن فرصت سے ڈھونڈ لوں گا۔ مگر اتنی آفیشل مصروفیات سے وقت نہیں نکال پایا کہ اپنے طور پر کچھ مدد کرتا آپ لوگوں کی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ وہ واقعی بہت افسردہ تھا۔ اماں جی اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو اپنے پہلے گھر جا کے رہنا ہے۔ مگر وہ تو ہم بیچ چکے ہیں۔ عالیہ نے دُکھ سے بتایا۔ کتنی یادیں جڑی تھیں اُس گھر سے۔ جانتا ہوں شیراز نے کہا۔ جب وہاں آیا تو مجھے گھر کے فروخت کی خبر ملی تھی۔ میں یہ کیسے ہونے دیتا۔ وہ عالیہ کا گھر تھا۔ میں نے دوبارہ عالیہ کے نام سے خرید لیا۔ عالیہ کے نام سے اماں نے حیرت سے پوچھا۔ جی اماں جی۔ عالیہ جو دس سال پہلے مجھ سے چھن گئی تھی۔ تب میں اُس کے قابل نہیں تھا۔ ورنہ روک لیتا۔ اے کاش مجھے پتہ ہوتا۔ تو کچھ بھی کر کے اپنی بیٹی کو برباد نہ ہونے دیتی۔ اماں جی ہر بات میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔

ستارہ سی آنکھوں میں دُکھ کی چمک تھی۔ مگر ایک اعتماد تھا، اِک یقین تھا۔ کچھ کرنے کا جذبہ تھا۔ اماں تو تڑپتی رہیں۔ وہ تو وقار جیسا ہی لگ رہا تھا۔ وقار جو کہیں کھو گیا تھا۔ اماں وہ کس ملک میں گیا تھا۔ پتہ نہیں بیٹے۔ شاید جرمنی گیا تھا۔ اماں میں اُس کا پتہ کراؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے۔ آپ کے دوسرے بیٹے کی ذمہ داری ہے۔ اماں نے کس کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے کبھی بھی چھوڑنا نہ چاہتی ہوں۔ کیا کھائیں گے میں جلدی سے بنا لیتی ہوں۔ اُسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں کہیں مُسکان اور خوشی تیرتی تھی۔ اتنا کچھ تو کھلا دیا۔ پیٹ بھر گیا۔ اب اِدھر آ کے بیٹھو اور

مجھے بتاؤ۔ اب کیا ارادے ہیں۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اور اب دونوں نے دُکھی نہیں ہونا۔ ماں صدقے میرے بچے تم نے آ کر ہمیں نئی زندگی دے دی۔ مجھے بھی تو نئی زندگی مل ہے نا۔ اماں جی۔ اُس نے عالیہ کو دیکھا۔ وہ شرما ہی گئی۔

عجیب دُھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ وہ اُس کی آنکھوں کی روشنی میں لہریں لیتی تھی۔ اچھا چلو تم لوگ باتیں کرو میں تھک گئی ہوں۔ اب پُرسکون ہوں اب تو میں آرام سے مر سکتی ہوں۔ اماں کیسی باتیں کرتی ہیں۔ عالیہ خفگی سے بولی۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ کل میں اور شہباز آئیں گے۔ آپ لوگوں کو آپ کے پرانے گھر منتقل کریں گے۔ شکریہ شیراز۔ وہ سامنے تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ واقعی تم میرے سامنے ہو۔ اِک خواب سا لگتا ہے۔ جیسے جاگوں گی تو سب غائب۔ ارے نہیں۔ مائی لیڈی (میری خاتون)۔ اُس نے عالیہ کے ہاتھ تھام لیے۔ اجازت ہے آپ کو یقین دلا دوں۔ اور پھر سانسوں کی مہکار اُس کے ہونٹوں پہ آ کر ٹھہر گئی۔ میں خوشی سے کہیں مر ہی نہ جاؤں۔ وہ بولی۔ نہیں میری جان اب تو ہمیں جینا ہے۔ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں گویا ہوا۔ ان شاءاللہ۔ کل۔ وہ اشارہ کر کے تیزی سے نکل گیا۔ عالیہ کتنی ہی دیر گلی سے باہر اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

یا میرے اللہ تیری کیسی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ ان دونوں کی ذمہ داری شیراز نے اُٹھا لی تھی۔ وہ اپنے پہلے گھر میں واپس آئے۔ ہر خوشی غمی پہ آنسو بہانا لازمی تھا۔ اماں اپنے کمرے میں جا کر کتنی ہی دیر ابا کو یاد کرتی رہیں، بھائی کا غم کھاتی رہیں۔ میرے بارے اُنہیں تسلی ہو گئی تھی۔ اب تو شیراز کی ہر شام ہمارے ساتھ گذرتی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب آنٹی ثمینہ اور انکل احمد علی اپنے بچوں کے ساتھ اُس گھر میں آئے جو کبھی ہمارا تھا۔ مگر اب شیراز نے عالیہ کے نام کر دیا تھا۔ عالیہ نے ہلکے گلابی رنگ کا سیاہ کناری والا سوٹ پہنا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لمبے سیاہ بال کھلے تھے۔ آنکھوں میں کسی کے چہرے کی روشنی جگمگاتی تھی۔

سب نے چائے پی۔ کھانا کھایا۔ اور پھر ہیرے کی انگوٹھی سے عالیہ کو مانگ لیا۔ اماں تو بس اللہ کا شکر ہی کرتی رہیں۔ روتی رہیں۔ ایک ہفتے بعد ہی سادگی سے نکاح ہو گیا۔ البتہ شیراز نے فائیو سٹار ہوٹل میں ایک گرینڈ ریسپشن دیا تھا۔ چاند سورج کی جوڑی نے سب سے داد وصول کی۔

ہوٹل کے ایک کمرے کو ہی حجلہ عروسی بنایا گیا تھا۔ عالیہ اپنی قسمت کے اِس پھیر پر حیران تھی۔ وہ اندر آیا تھا۔ تو میڈم دیکھا آپ نے قسمت یوں بھی پلٹ جاتی ہے۔ آپ ہماری قسمت میں لکھی تھیں۔ اِس لیے تو ہم نے کسی اور کو اس دل میں آنے ہی نہیں دیا۔ وہ قریب آ گیا۔ بہت قریب۔ ستاروں نے اپنی کہکشاں کمرے میں اُتار دی تھی۔ قسمت بدل گئی تھی۔ حُسن کے دیوتا نے عشق کی دیوی کی مانگ اپنے ہونٹوں سے بھر دی تھی۔

☆☆☆☆☆

دل نیم شب

جوان جسم چارپائی پر مسلسل کروٹیں لے رہا تھا کہ ٹوٹ ہی تو جائے گا، خالی بان کی چارپائی پر ایک ہلکی سی بھی چادر نہ تھی، کمان کی سی کمر پر نشان بھر آئے تھے بے قراری تھی کہ تھمنے میں نہ آ رہی تھی۔

تصور میں کسی کے پیار بھرے لمس کا احساس شوریدہ جذبوں پر لمحہ بھر کو مرہم رکھتا مگر جب یہ سپنا ٹوٹتا تو تشنگی اور لاچاری کا احساس ہوا ہو جاتا ہے۔ بے قراری روح کو کچلنے لگتی۔

اف..... یہ تنہائی، چاندنی رات اور چڑھتے جذبوں کی بے قابو ندی، جوانی، انگڑائیاں لے، لے کر دہائیاں دے رہی تھی۔

20 سال کی بھرپور جوانی نہ سنبھلنے میں آتی تھی۔ نہ سسکنے سے باز آتی تھی۔ ریشم کی ملائم ڈور کی طرح ہاتھ سے پھسلتی جا رہی تھی۔

چاندنی راتیں اس کے اندر ایسا ہیجان اور جوش پیدا کرتیں کہ ریشماں کی راتیں کروٹیں بدلتے بدلتے من کی اگن، تن کی تڑپ میں جھلتی رہتیں۔

انہی تصورات میں جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

''اٹھ جاری ریشماں دن چڑھ آیا ہے۔ اری کم بخت اپنی قمیص کو ٹھیک کر، گھر میں بھائی ہے پر تجھے کوئی خبر نہیں رہتی۔ ہزار بار کہا ہے چادر اوڑھ کے سویا کر.....''

اماں لگیں صبح صبح باتیں سنانے ریشماں جلدی سے اٹھی بال سمیٹے اور پاس رکھا دوپٹہ خود پر پھیلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

آٹا گوندھ دیا میں نے، جلدی سے آگ جلا اور پراٹھے بنا، بھائی جانے کو ہے تیرا.....

ماں نے حکم نامہ جاری کر دیا۔

صحن کے کونے میں بنے غسل خانے میں جا کر دو چار چھینٹے مار کر وہ دوپٹے سے منہ خشک کرتی۔ مٹی کے چولہے میں لکڑیاں ڈال کر گھاس پھوس سے آگ جلانے لگی۔

آنکھوں میں دھواں بھرنے لگا تھا۔

کہ شمیم بھابی کمرے سے برآمد ہوئی۔ پوڈر، سرخی لگائے، لمبے گیلے بال سلجھائے، اک شرمیلی مسکان لبوں پر سجائے۔

ریشماں کے اندر اسے دیکھتے ہی عجیب سی کسک اٹھی۔ وہ زور زور سے آگ پر پھونکیں مارنے لگی۔

''بن گئے پراٹھے؟'' وہ پاس آ کر پوچھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

فصیحہ آصف خان

بل دیتے پیڑے کو ریشماں مزید بل دیتے ہوئے بولی۔

''بس تھوڑی دیر میں..... تیار ہیں۔''

اتنے میں خورشید دہی لے آیا۔

شمیم نے بڑے پیالے میں دہی ڈالا۔ آدھے دہی میں چینی ڈال کر ہلانے لگی۔ اماں بکری کا دودھ لے آئی۔

پھر گرم گرم پراٹھے کے ساتھ دہی کھاتے ہوئے نہ خورشید کو خیال آیا نہ شمیم کو کہ آگ کی مانند جھلستی ریشماں کی جوانی کو خاک ہونے سے بچائیں۔ راکھ ہونے سے بچائیں وہ اپنی اور اماں کی روٹی بنا کر دہی کے ساتھ کھانے لگی۔ آم کے اچار کی پھانک بھی پراٹھے پر رکھ لی تھی۔

چائے بھی بن گئی، شمیم اندر سے رات والے برتن لے آئی۔ ریشماں برتن دھو کر صحن کی صفائی کرنے لگی۔

روزانہ ایک سے کام کر کر کے وہ بدول ہونے لگی تھی۔ اماں سبزی لے آئی۔ خورشید بھائی کام پر چلا گیا۔

شمیم اندر سو رہی تھی، رات کی جاگی ہوئی، شادی کو تین ماہ ہو گئے تھے، مگر ابھی تک وہی چونچلے دلہنوں والے۔

اماں کو خورشید سے ویسے بھی سارے زمانے سے زیادہ پیار تھا، تو اس کی بیوی سے کیوں نہ ہوتا؟ ریشماں کسی گنتی میں نہ آتی تھی، اس کی پیدائش کے بعد ماں ابھی چھلے میں تھی کہ اس کا باپ غفور سانپ کے کاٹنے کے باعث فوت ہو گیا۔ جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھ لی تب سے اس کی توجہ ریشماں کی طرف سے ہٹ گئی۔ اوپری دل سے وہ اسے دودھ پلاتی۔ اک مصیبت سمجھ کر اس نے ریشماں کو پالا خورشید ہی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا وہ اسی پر محبتیں نچھاور کرتی۔

ریشماں دکھ اور درد دل محسوس کر رہی تھی، نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی اور کوئی نہ باپ جو لاڈ اٹھائے۔ اپنا آپ مار کر وہ پانچ جماعتوں تک پڑھ گئی۔ مگر حالات نے بہت کچھ پڑھایا، سکھایا..... اس طرح وہ وقت سے پہلے ہی بڑی ہو گئی۔ سولہویں سال، مچلتے ارماں، اٹھتی جوانی، کاجل بھری آنکھیں، رسیلے لب اور قیامت خیز سراپا۔

انگ انگ سے رعنائیاں پھوٹتی تھیں۔ نمکین چہرے پر گلابیاں بکھرنے کا موسم ٹھہر گیا تھا۔ سانسوں کا زیر و بم طوفان برپا کر ڈالتا تھا۔ ماں کے ساتھ اپلے تھاپتی، بازو اوپر کرتی تو جوانی کی کرنیں، سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگتیں، سانسیں بکھرنے لگتیں۔

''دوپٹہ نیچے کر..... گلے میں پھندے کی طرح ڈال رکھا ہے، جھلی نہ ہو تو.....'' ماں کی ڈانٹ میں اک خدشہ اور وہم بھی نمایاں تھا۔

ریشماں نے خود پر نگاہ ڈالی، سانسوں کے زیر و بم نے اندرونی اتار چڑھاؤ کے سبب

اک ہلچل سی مچا رکھی تھی۔

''اچھا..... اماں۔'' اس نے دوپٹہ گردن سے کھینچ کر ذرا نیچے کیا، پھر کام میں لگ گئی۔

اسے خود پر بلاوجہ ہی پیار آ رہا تھا۔ ماں کے ساتھ سر پر چھڑیوں کا گٹھا اٹھائے وہ گھر آ رہی تھی۔ جب کئی نظریں اس کے سراپے کے آر پار ہونے لگیں۔ یہ جانے بغیر کہ کوئی میٹھی میٹھی نظروں سے تک رہا ہے۔

اب اسے یہ کون سمجھاتا کہ محبت کی نظر اور ہوس کی نگاہ میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ منہ زور جوانی کی تند تیز لہریں اسے جذبات کے اندھے کنویں میں دھکیل رہی تھیں۔

ماں کا رعب، بھائی کا غصہ، کب کسی نے پیار سے بات کی تھی؟ وہ تو پیار کی پیاسی تھی۔ من، تن، رواں، رواں پیار کے لیے مچل اور ترس رہا تھا۔

''شرم کریا کر..... ذرا حیا کر، دوپٹہ کھول کر اچھی طرح لپیٹ'' اماں اس کے باہر جانے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''ہاں..... نمازاں پڑھنے جا رہی ہوں .....'' ریشماں ادب ولحاظ بالائے طاق رکھ کر بولی۔

''تیری زباں ٹوکے سے کاٹ دوں گی.....'' اماں کی آواز میں دھمکی ہی دھمکی تھی۔

''جا..... دفع ہو جا، جلدی آنا۔'' اماں اپنے کاموں میں لگ گئی۔

شمیم آج کل میکے گئی ہوئی تھی..... ریشماں کی سہیلی صفیہ اسے بلا رہی تھی۔

بڑی مشکل سے آج اماں نے جانے دیا تھا۔ کاجل بھر بھر آنکھوں میں ڈالا، ست رنگا پراندہ گھماتی، دوپٹہ ادھر ادھر ہوا میں لہرا رہا تھا، مست جوانی بھٹک رہی تھی۔

گاؤں کے کچھ لڑکوں نے اسے آنکھ بھر کر دیکھا، ریشماں ذرا سا گھبرائی، پھر اپنا راستہ لینے لگی۔

پر نظریں کب تک چراتی.....

افضل امیر گھرانے کا گھبرو جوان تھا۔ پکا مکان، کئی بھینسیں، گائیں، بکریاں، زمینوں کا شمار نہ تھا۔ اس نے کام کاج کیا کرنا تھا۔ اکلوتا بیٹا تھا، زمینوں پر چلا جاتا، دو بہنیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ماں الگ ٹھسے دار عورت تھی۔ کئی گھرانے صبح کے وقت دودھ، لسی مفت لے جاتے۔

ریشماں کی ماں بھی لسی افضل کے گھر سے لے جاتی تھی۔

مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔

افضل اور ریشماں ایک دوسرے کو دیکھ کر دل ہار بیٹھے تھے۔ چوری چھپے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اب ریشماں اپنی سلگتی جوانی پر مرہم محسوس کرنے لگی تھی۔ افضل شریف انسان تھا، خود ریشماں بھی حد میں رہتی۔ پر جب کبھی افضل ہاتھ پکڑتا تو پورے بدن میں نامعلوم سنسناہٹ رقص کرنے لگتی۔

ریشماں کے بے قرار انگ میں سکون اتر آتا۔ اس قدر اضطراب میں بھی۔
اب گال دہکنے لگے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اپنے آپ دمکنے لگی تھی۔ اماں اسے دیکھ کر چونک جاتی۔
کبھی وہ ریشماں کو بلاوجہ ہنستے دیکھ کر حیران ہوتی، تو کبھی اس کے قہقہے پر تپ جاتی۔
''بند کر یہ ٹھی..... ٹھی..... وہ گھور کے بولتی۔
ریشماں بجائے منہ بنانے کے اور زور زور سے ہنس پڑتی۔
''سایہ تو نہیں ہو گیا اس پر..... شمیم اپنا خیال ظاہر کرتی۔''
''نکالتی ہوں میں اس کا سایہ.....'' اماں غصے سے ریشماں کی کمر پہ دو دھموکے جڑ دیتی۔
''کیا ہے اماں..... بس کر.....'' ریشماں چنگاری اس کے بدلے تیور دیکھ کر ساس بہو ٹھٹکیں مگر، ریشماں غصے سے دھم دھم کرتی اندر چلی گئی۔
تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔
''اماں اس کا ویاہ کر دے..... مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' شمیم نے ساس کے کان میں سرگوشی کی اور مشورہ دیا۔
ہائے ربا کیا کروں..... برادری میں اس کے جوڑ کا کوئی ہوتا تو اب تک اس مرن جوگی سے پیچھا چھڑا چکی ہوتی۔ کرتی ہوں بات خورشید سے۔

دھان کے کھیت کے اندر دونوں دبکے بیٹھے تھے۔ شرمیلی مسکان سجائے وہ افضل کے دل پہ بجلیاں گرا رہی تھی۔
اماں سے کروں گا بات..... آج ہی.....
افضل اس کے بھرے بھرے سراپے پر نظریں جما کر بولا۔
''اب تیرے بن رہا نہیں جاتا.....'' اس نے ریشماں کے گداز بدن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے لاڈ سے کہا۔
مستی افضل کے رگ رگ میں سما رہی تھی۔
ریشماں نے اس کو پرے دھکیلا..... خود بھی دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
''ابھی صبر کر افضل، میں تیری امانت ہوں، بس اب دیر نہ کرنا، میں بھی اب تیرے بغیر جی نہیں سکتی۔''
ریشماں کی آواز بھرا گئی تو افضل اسے تسلیاں دینے لگا۔

سر جھکائے وہ کمرے میں اداس بیٹھا تھا کہ اسے دیکھ کر اس کی ماں ہاجراں کا ماتھا ٹھنکا..... کوئی بات ہے ضرور..... وہ سوچنے لگی.....
''وے افضل کی ہویا اے.....'' وہ پیار بھرے انداز میں پاس آ کر بولی۔
''دوپہر کو وی تو نے روٹی بچا دی..... کیا بات ہے بتا تو.....''
ہاجراں اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے بولی۔

تو افضل نے اداس آنکھیں ماں پر جمائیں۔
''میں ویاہ کرنا چاہتا ہوں اماں..... خورشید کی بہن ریشماں ہے۔''
افضل کی بات پر گویا ہاجراں کو ڈنگ لگا۔ وہ اچھل کے کھڑی ہوگئی۔
''کیا..... وہ کمی، کمین..... چھوٹے لوگ..... تو پاگل تو نہیں ہوگیا..... ہوش میں ہے..... لوگ کیا کہیں گے، ساری برادری تھوتھو کرے گی۔'' وہ سینے پر دو ہتر مار کر رونے لگی۔
''کیا مطلب اماں..... شادی میں نے کرنی ہے، زندگی میری ہے لوگوں کو کیا؟''
''افضل.....'' وہ اب کے ذرا تلخ ہو کر بولی۔
''بس اس سے آگے اور کچھ مت کہنا..... تیرا ویاہ بھائی ہدایت کی دھی زبیدہ سے ہوگا..... ہماری بات ہو چکی ہے۔ میں کل ہی جا کے ویاہ کی تاریخ لے کر آتی ہوں۔''
پتہ نہیں کون پچھل پیری تیرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ تیرے باپ کو پتہ چل گیا تو طوفان آجائے گا۔ اس بات کو ادھر ہی دفن کر دے۔ کسی کو کان وکان خبر نہ ہو، ہاجراں اپنا ازلی رعب اس پر جماتے ہوئے بولی، یہ دیکھے بنا کہ افضل کے چہرے پر تاریک سائے نے راج کر لیا تھا۔
وہ سرد آہ بھر کے سر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر تکیے پر افسردہ لیٹ گیا۔ ریشماں کی الہڑ جوانی، محبت، سب اک خواب سا ہو کر رہ گیا تھا۔
عجیب حالت ہو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پر، اکلوتی اولاد کے سبب ماں، باپ کے سوا رمان تھے۔ وہی ان کی امیدوں کا واحد سہارا۔
نہ ان سے لڑ سکتا تھا، نہ بات منوا سکتا تھا، نہ اس بات کی ہمت پاتا تھا کہ ریشماں کو آگاہ کر سکے۔

ریشماں پریشان تھی کہ افضل جو اس سے روزانہ ملے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔ تین چار دن سے صورت تک نہ دکھائی تھی۔ وہ بن جل مچھلی کے تڑپ رہی تھی کہ پانچویں دن ہاجراں چلی آئی۔ ایک ملازمہ ساتھ تھی۔ ڈھکی پلیٹ تھامے اماں اور شمیم اس کے آگے بچھ گئیں۔
''آؤ ملکانی جی..... کیسے رخ کر لیا آج ادھر کا؟'' اس کی عزت افزائی کرتے ہوئے احترام سے بولی۔
''میرے اکلوتے پتر افضل کی شادی طے ہو گئی ہے۔ میری بھانجی زبیدہ کے ساتھ یہ..... یہ لو مٹھائی کھاؤ۔'' اس کی آواز پر اندر بیٹھی ریشماں کے کلیجے پر برچھی ہی تو چل گئی، آنسو گالوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی پھسل آئے اپنی محبت کی موت پر وہ کھل کر ماتم بھی نہ کر پا رہی تھی۔ ارماں مٹی میں مل گئے تھے۔ افضل کیسا بودا انسان نکلا، روشنی کی ذرا سی کرن دکھا کر اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ تقدیر کا وار کس قدر بھیانک تھا۔
وہ کتنی دیر روتی رہی، کوئی کام کرنے کو من تھا

ہی نہیں کہ شمیم لڈو لیے اندر آ گئی۔ پر وہ منہ سر لپیٹے اندر ہی پڑی رہی۔

برادری میں ریشماں کے جوڑ کا کوئی تھا ہی نہیں۔ ورنہ اب تک وہ رخصت ہو چکی ہوتی۔ افضل کے ساتھ بھی سنجوگ ممکن نہ تھا۔ وہ غیر برادری کا تھا۔ شاید بڑے لوگوں کی خواہش پر اماں اور خورشید مان جاتے۔

خورشید رات کو شمیم سے اسی موضوع پر بات کر رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک بجلی کی طرح سوچ در آئی۔

''برادری میں کوئی ہے نہیں، غیروں میں تم نے جانا نہیں، کب تک بٹھائے رکھو گے۔ خورشید.....'' شمیم اسے شیشے میں اتار رہی تھی۔

''میرے چاچے رحیمو کا بیٹا ہے گورا..... تو نے دیکھا تو ہوا ہے، بڑا تو شادی شدہ ہے۔ گورا (فاروق) ہے تو کہے تو بات کروں؟''

''گورا، فاروق..... وہ دس سال کا.....''

خورشید اچھلا۔

''تو کیا ہے..... اپنی برادری کا تو ہے..... چھوٹا بڑا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ریشماں کا گھر بن جائے گا۔ بہت پیسہ ہے چاچے کے پاس، ریشماں ساری حیاتی عیش کرے گی۔''

شمیم کی لچھے دار باتوں میں وزن تھا۔ خورشید شش و پنج میں پڑ گیا۔

''چل اب سو جا..... صبح اماں سے بات کرنا۔'' خورشید نے کروٹ بدل لی۔

اماں پہلے تو خاصی جز بز ہوئی، پھر خورشید اور شمیم کے بار بار سمجھانے پر آمادہ ہو گئی، اس شرط پر کہ ریشماں سے سب کچھ چھپایا جائے گا۔ اس کو بس یہی بتایا گیا کہ شادی ہو رہی ہے۔

شمیم کے چا چا..... چاچی آئے..... پیسے، کپڑے اور مٹھائی دے گئے۔

ریشماں پہلے تو بے دلی سے دیکھتی رہی۔ پھر خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ سر اٹھاتی تو کچل دیا جاتا، زبان کھولتی تو کٹ جاتی۔

جو آتا، کپڑوں، چیزوں کی تعریف کرتا، بڑا اونچا امیر خاندان ہے۔ اپنی قسمت پر رشک کر کے ہولے ہولے ریشماں خود کو آمادہ کرنے لگی۔ ارمان نئے سرے سے پنپنے لگے۔ آنکھیں پھر سے سپنے بننے لگیں۔

آنے والے خوشگوار اور مہوش دنوں کا احساس من میں بجلی بھر دیتا۔ راتیں سہانی لگنے لگی تھیں۔

''فاروق.....'' نام کی مالا دن رات جپنے لگی تھی۔ اماں اور شمیم باقی ماندہ جہیز بناتی رہتیں۔

رات ہوتی تو ریشماں کو مضبوط گرم بازوؤں کا احساس سونے نہ دیتا۔ فاروق کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھے ساری رات سپنوں میں کھوئی رہتی۔ آنے والے دلفریب لمحات خون کی گردش کو تیز کر

دیتے۔ تب وہ تکیہ بازوؤں میں بھینچ کر رہ جاتی۔

دن گزرتے گئے..... یہاں تک کہ شادی کے دن قریب آ گئے۔

مایوں کا جوڑا پہن کر وہ نکھر گئی تھی۔ مہندی سے ہاتھ، پیر رنگے گئے۔ نکاح بھی ہو گیا..... چھوہارے تقسیم ہو گئے۔

رخصتی کا وقت آیا..... تو وہ ماں، بھائی اور شمیم بھابی کے گلے لگ کر رو پڑی۔ پھولوں سے لدی گاڑی میں بٹھایا گیا۔

سب اس کے دلہن بنے روپ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ اب دولہا کیا کہتا ہے؟ اسے تو بس ان لمحات کا انتظار تھا، دو گھنٹے کے سفر کے بعد گھر آ گیا۔ اس کی نند اور ساس نے گاڑی سے آرام سے اتار کر سجے ہوئے کمرے میں لا بٹھایا۔

شمیم اس کے ہمراہ تھی۔

کمرے میں رکھی میز پر پھل، مٹھائی، دودھ، شربت رکھا گیا، مگر اس سے کچھ کھایا ہی نہ جا رہا تھا۔ بھاری کپڑے اور زیور الجھن پیدا کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پرتکلف کھانا آ گیا۔ مگر ریشماں کو صرف دولہا کا انتظار تھا۔

لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ، کھانا، رسمیں سب کچھ کئی گھنٹے جاری رہا۔

''چلو کڑیو، بالیو باہر چلو، اس کی ساس نے کہا تو سب قہقہے لگاتی باہر چلی گئیں۔ شمیم نے اس کا گھونگھٹ نیچے کر کے پیار کیا اور خود بھی باہر چلی گئی۔ اب ریشماں اکیلی تھی۔ ذرا سی نظریں گھمائیں اور سجے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا..... قیمتی ساز و سامان اور ضرورت کی ہر چیز تھی۔ وہ ابھی دیکھ ہی رہی تھی کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور کوئی دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

''میری وہٹی، میری دلہن کہتا ہوا، وہ بستر پر آدھکا'' ریشماں گھبرا گئی۔

''کون..... کون.....'' اس نے ذرا سا گھونگھٹ اٹھا کر اس سجے، سنورے دولہا کا روپ لیے بچے کو دیکھا..... اور گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

جبکہ وہ گود میں آتے آتے رہ گیا۔

''میں..... گورا..... فاروق..... تیرا دولہا۔''

اس نے معصومیت سے آگے بڑھ کر گلے میں پڑا ہار تھامنا چاہا..... تو جیسے ریشماں کے سر پر بم پھٹا..... وہ چکرا کر ایک طرف گرنے لگی۔

اس کی حالت دیکھ کر فاروق ''اماں..... اماں'' کہتا۔ اپنی ماں کو بلانے دوڑا۔

جب ریشماں کو ہوش آیا تو وہ ایسے تھی جیسے کوئی بھرے پرے گھر کو لوٹ کر لے گیا ہو۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح جو ساری جمع پونجی ہار کر کھلے سر اور کانپتے قدموں بے بسی سے چل رہا ہو۔

صدمے کی کیفیت میں وہ اپنے نصیب کو بدنصیبی میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

درویش

حیات بچپن سے ہی متین مزاج اور خاموش طبع واقع ہوا تھا بچپن کے ایام میں والدین اور رشتہ دار اس کی بھولی بھالی صورت اور فربہ شخصیت سے بہت زیادہ مانوس تھے اور یوں وہ پورے خاندان کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا اور اس کی معصوم اور حسین اداؤں کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا کہ جیسے سیب انناس اور پپیتے کا رس یکجا ہو گیا ہو۔ ہر بچپن کے رخصت ہونے کی طرح حیات کا بچپن بھی کئی خوبصورت اور دلفریب یادوں اور تصویروں کے ساتھ رخصت ہو گیا اور پتہ ہی نہ چلا کہ کب حیات کی جگہ اس کے چھوٹے بہن بھائیوں نے لے لی۔ حیات کی جوانی، جوانی تھی۔ دراز قد، چوڑا سینہ خوبصورت موٹی موٹی آنکھیں صاف شفاف چہرہ قرینے قرینے ہاتھ پاؤں خوبصورت موتیئے جیسے چمکدار دانت اور پھر حسین شباب میں سفید چہرے پر ہلکی سی داڑھی نے گویا چاند زمین پر اتار دیا تھا۔ حیات لڑکپن میں سکول کے انتہائی ذہین بچوں میں شمار ہوتا تھا میٹرک امتیازی پوزیشن میں کرنے کے بعد حیات نے ایف۔ایس۔سی۔ میڈیکل گروپ میں داخلہ لیا مگر اس وقت تک اس کی انوکھی، مذہبی اور غیر متوقع عادات سے سب شاکی ہو چکے تھے۔ حیات اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اس حوالے سے حیات کا والد اس سے کئی امیدیں لگائے بیٹھا تھا جن میں سب سے بڑی امید یہ تھی کہ تم نے ڈاکٹر بننا ہے جبکہ حیات نہ صرف مستقبل کے خوابوں سے دور تھا بلکہ وہ تو جیسے اس مادی زندگی سے بھی بیزار تھا اکثر تعلیمی سرگرمیوں میں عدم دلچسپی کی وجہ سے والد اور حیات کے درمیان بحث مباحثہ ہوتا رہتا تھا حیات کا والد ایک مادیت پرست انسان تھا جو ظاہری دنیا کے عروج کو ہی انسانیت کی معراج سمجھتا تھا جبکہ حیات روحانی زندگی اور مذہبی اقدار کو انسانیت کا عروج اور بقائے دوام سمجھتا تھا۔ حیات نے اکثر اوقات تعلیمی اخراجات بھی مذہبی اخراجات کی نذر کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف اس کے گھر والے بلکہ خاندان کے لوگ بھی اس جدید دنیا میں حیات

محمد شفیق

کے ان کاموں کو نہ صرف اس کے دقیانوسی خیالات سمجھتے بلکہ ان امور پر اس پر جی بھر کے ٹھٹھہ مذاق بھی کرتے لیکن حیات ان باتوں کی کدورت کو بھی اپنی دلفریب مسکراہٹ میں اڑا دیتا۔ بلکہ اکثر اوقات تو یہاں تک بھی کہہ دیتا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا ابھی اس کا وقت نہیں - مگر سننے والے اس کی ان باتوں کو بے مقصد اور بے فائدہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ حیات نے اپنے پرائے ہر انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا ہوا تھا اور دوسری غیر متوقع باتوں کی طرح کئی بار اپنے خاندان والوں سے اس بات پر طنز کا نشانہ بنا کہ بیگانوں کے درد اور کام تم نے اتنی ذمہ داری سے اُٹھائے ہوئے ہوتے ہیں جتنا اپنے کام کاج سے دور ہو۔ حیات ان باتوں پر کبھی تو خاموش ہو جاتا اور کبھی صرف ایک ہی جملہ کہہ دیتا تمہیں پتہ چل جائے گا حیات کو اکثر اوقات مختلف بزرگوں کے مزارات پر بھی حاضری دیتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ حیات اب سکون کی گولیاں لے کر کئی کئی دن تک سویا رہتا جس کی وجہ سے خاندان والے اس پر کئی کئی جملے کستے مگر اسے کسی کی کوئی پرواہ ہی نہ تھی وہ اپنی من کی دنیا میں بڑا امیر کبیر انسان تھا اکثر اوقات اپنے جیب سے بھی خفیہ طور پر محلے اور شہر کے غریب غربا لوگوں کی مدد کر دیتا تھا، اور بہت زیادہ ہوتا تو انہیں صرف یہ کہہ دیتا کہ میرے خاندان والوں سے اس کا ذکر نہ کرنا اور یہ بات سن کر لوگ اس سے یقین دلا دیتے کہ ہمیں اپنی مدد سے مطلب ہے نہ کہ ڈھنڈورا پیٹنے سے، حیات ہمیشہ خوش اخلاق ملنسار اور ہمدرد انسان کے روپ میں ہی نظر آتا تھا اور کبھی کبھی تو دوسروں کے دکھ کی خاطر اپنے آرام سکون اور روپے پیسے کو بھی داؤ پر لگا دیتا تھا۔ حیات کی طبع جولانی میں بلا کی روانی تھی ان کی زندگی اس بات کا آئینہ تھی کہ وہ کبھی تشکیک کی زد میں نہیں آئے صداقت پر ان کا ایمان پختہ تھا۔ حیات کا اپنا ایک خاص انداز تھا اور یہ منفرد سٹائل ہی انکی پہچان تھا۔ منفرد انداز سوچ اور مشاہدہ تھا ان میں بے ساختگی اور قدرتی پن تھا انکا طرز تکلم دلچسپ اور بلیغ ہوتا تھا۔ حیات زندگی بھر تدبیر اور تحقیق کی تلاش میں رہے ہمیشہ دوسروں کو صداقت پر ابھارتے رہے اور یہ سب عوامل عیاں کرتے ہیں کہ حیات ایک درویش صفت انسان تھا اور قلندرانہ فکر کا حامل تھا کیونکہ جہان تازہ کی افکار تازہ سے نمود ہوتی ہے۔ جب آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ نے اپنے مقاصد کا تعین کر لیا ہے پھر اس وقت ان کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگنے کا مرحلہ آتا ہے اور اسی کا نام عرفان ذات ہے حیات اپنی ذات کا عرفان حاصل کر چکا تھا اس لیے اب وہ بجائے مادی ترقی اور تعمیر کے روحانی عوامل اور عناصر پر مکمل توجہ مبذول کرتا تھا کیونکہ ایک مادیت پسند انسان آنکھیں کھول کر اردگرد کے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے فکر و تدبر سے مسائل کا حل دریافت کرتا ہے اور ان

مسائل کا حل دریافت کرنے کے بعد جہد مسلسل اور عمل پیہم سے منزل کی طرف بڑھتا ہے مگر ایک روحانی شخصیت یا درویشانہ روش رکھنے والی ہستی اپنی آنکھیں بند کر کے اردگرد کے حالات سے بے خبر، مسائل کا ادراک لیے بغیر، اور مسائل کا حل دریافت کیے بغیر اپنی دھن میں سفر کرتی رہتی ہے ور اپنی تنہا دنیا کا مسافر بن کر چلتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اس کے حالات کے شیرازے کو نہ بکھیرے کیونکہ اس کی دنیا محض چند جذباتی اور روایتی لوگوں کی طرح نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسی شخصیات سے کسی کے دل میں تحقیق و اکتشاف کی لہر پیدا ہوتی ہے حیات کی شخصیت ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر سب کی بھلائی کے لیے سوچنے اور مشورہ دینے والی تھی۔ اس سلسلے میں وہ رہنماؤں اور مقتدر طبقات کی توجہ خود احتسابی اور خود انتقادی کی طرف دلاتے رہتے تھے۔

قدرت کا قانون ہے کہ نادر اور قیمتی متاع ہمیشہ مختصر وقت کے لیے حاصل ہوتی ہے۔ عین شباب میں ہی حیات کو مختلف دماغی بیماریوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔ حیات کا خاندان ایک مضبوط متوسط خاندان تھا جنھوں نے حیات کے علاج معالجے میں کبھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی البتہ حیات کی خود فہمی اور دنیاوی زندگی سے بے اعتنائی اور دوسروں پر فیاضی کے سبھی ثنا کی رہتے تھے۔

حیات اکثر انہیں ایک ہی جملہ کہہ دیتا کہ تمہیں پتہ چل جائے گا۔ حیات کی جوانی بے داغ اور فسق فجور سے پاک تھی وہ اپنے من کی مستی میں رہنے والا انسان تھا۔ اب بیماری کے ہاتھوں کبھی اگر بے بس بھی ہو جاتا تھا مگر اس کی خودداری اور انا اپنی جگہ پر ہر وقت برقرار رہتی تھی۔ مختلف سیکاٹرسٹ اور میڈیکل سپیشلسٹ سے کئی معائنے کرانے کے بعد بھی حیات کی بیماری کا مکمل علاج نہ ہو سکا اور ان کا یہ مرض دن بہ دن بڑھتا گیا مگر ایک چیز جو نہ صرف اس کے لواحقین نے دیکھی بلکہ پورے رشتہ داروں اور اہل شہر نے محسوس کی کہ اتنی قوی شخصیت کو اتنی بڑی بیماری کے بعد بھی کسی نے نہ جسمانی طور پر کمزور ہوتے دیکھا اور نہ کسی نے ٹینشن یا ڈپریشن میں دیکھا بلکہ جب بھی کوئی اس سے طبیعت کے متعلق استفسار کرتا تو الحمد کہنے کے بعد اس کا دوسرا جملہ یہ ہوتا کہ میں تو بیمار ہوں ہی نہیں۔ مجھے کیا ہوتا ہے۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور ایک دن حیات اپنی دماغی حالت کے باعث پہلے اپنے شہر پھر اپنے ضلعے اور پھر اپنے صوبے کے صدر مقام کے ہسپتالوں سے ہوتا ہوا وادی موت میں جا سویا اور سب کے لیے ایک انوکھا اور درد بھرا درس عبرت چھوڑ گیا کہ یہ زندگی عارضی ہے اس لیے مادیت پرستی کے بجائے روحانیت کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشش کرنی چاہیے اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنی چاہئیں جو پوری عمر حیات کا وطیرہ رہا اور آج بھی جب میں سوچتا ہوں تو اس کا ہر موقع پر دہرائے جانے والا جملہ میری پلکوں کو بھگو دیتا ہے کہ، تمہیں پتہ چل جائے گا۔

☆☆☆☆☆

''نیلو نیل''

نیلا رنگ مجھے بہت پسند تھا----

اب رنگوں کی کیمیا گری کا ہنر جاننے والے ہی واقف ہوں گے یا رنگوں و برجوں کا آپسی تعلق جوڑنے والے ہی جانتے ہوں گے کہ نیلے رنگ کی پسندیدگی اور استعمال کی کیا افادیت ہوسکتی ہے یا کہ یہ دلکش رنگ شخصیت کے لیے خوش بختی کے کون کون سے سہانے در وا کرسکتا ہے ؛ کہ میں اس سلسلے میں قطعی لاعلم ہوں - مجھے بس ویسے ہی یہ رنگ بہت بھاتا ہے اور جہاں نظر آئے دیکھ کر دل اس کے لئے مچلنے لگتا ہے - یہ پسندیدگی کوئی نئی بالکل بھی نہیں؛ میری یہ خواہش اور پسند اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ میں خود- بچپن میں اپنے گاؤں کی مٹی سے بھری کچی گلیوں میں ننگ دھڑنگ یا آدھے لباس میں ملبوس، بنا جوتوں یا چپل کے بھاگتے دوڑتے اور مٹی کے مرغولے اڑاتے اڑاتے جب بھی کہیں یہی نیلا رنگ نظر آجاتا، ہم رک کر اس کا تماشا دیکھنے میں مصروف ضرور ہو جاتے - نیلا ساگر، نیلے قنات، نیلا لباس یا کسی الہڑ دوشیزہ کا ہوا میں سرسراتا نیلا آنچل، سب کچھ بہت ہی بھلا لگتا تھا--

سوچنے کا موقع ملتا تو خیالات اور تصورات کی پر کیف دنیا میں ڈوب کر میں دیکھتا کہ نیلے رنگ کا نیا بھڑکیلا جوڑا پہن کر، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں ناز نخروں سے موٹر کار سے اتر آتا ہوں اور خوش خرامی کے انداز میں چلتے اپنی گلی میں داخل ہوتا ہوں - لوگوں کی حیرت میں ڈوبی للچائی نظریں برابر میرا تعاقب کر رہی ہوتی ہیں، اور میں سب سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ جاتا ہوں- گویا میری خوش لباسی کو داد تحسین پیش کیا جارہا ہو------ !!!!!

نیلے رنگ سے میری اولین شناسائی ماں جی کے نیلے لباس کو دیکھ کر ہوئی - ممتا سے بھرپور اسی نیلی گود میں میں پلا اور بڑھا- یہ جوڑا اگرچہ اب بہت بوسیدہ اور پرانا ہو چکا تھا مگر ماں جی اسے کبھی کبھار ہی لکڑی کے صندوق سے نکال کر پہنتیں اور بھی خاص خاص موقعوں پر - شاید ان کا یہی ایک ڈھنگ کا جوڑا رہ گیا تھا - یہ جوڑا کافی پرانا تھا اور کبھی کے اچھے وقتوں کی یاد دلاتا رہتا تھا، شاید اماں جی کے شادی کے وقتوں کا جوڑا تھا - مزید نئے کپڑے خریدنے اور

نور کمال شاہ

بنانے کی پھر بھی استطاعت ہی نصیب نہیں ہوئی۔ نئے کپڑے آج کل کہاں، اب تو روکھی سوکھی روٹی ہی میسر آ جائے تو غنیمت ہے۔ سو اسی ایک جوڑے کو متاعِ عزیز بلکہ متاعِ جاں سمجھ کر سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ بہرحال اماں جی جب اور جس بھی موقعے پر یہ نیلا جوڑا نکال کر پہنتیں، مجھے بہت ہی بھلا لگتا اور میں اسے دیر تک محویت کے عالم میں دیکھتا رہتا۔ ابا جی کی پگڑی کا چادر بھی تو نیلا ہی تھا اور پارو کا دوپٹہ بھی......

نیلا رنگ پارو کو بھی بہت پسند تھا۔ پارو اپنے ہی گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی، سندر اور حسین، میرے ساتھ ہی گاؤں کے سکول میں داخل تھی مگر دو تین جماعتیں پڑھنے کے بعد اس کے باپ نے اسے شہر کے مہنگے سکول میں داخل کرا دیا تھا۔ شہر ہماری بستی سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا، قریب ہی پڑتا تھا اور اس کا فاصلہ گاؤں سے فقط پانچ چھے کلو میٹر ہی بنتا تھا۔ پارو کو لینے سکول کی گاڑی روزانہ ہماری بستی میں آتی اور چھٹی کے بعد سہ پہر کو دوبارہ اسے واپس گھر پہنچا آتی۔ پارو مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور اس کی وجہ شاید ہمارے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی بھی تھی۔ پارو؛ نیلے رنگ کی رسیا، دراز قد، جھیل سی گہری آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، ریشم سے ملائم گال، ہوا سے لہراتی ریشمی سیاہ زلفیں اور دلکش سراپا---

پسند کیے جانے کے لیے یہی کافی اوزار ہوتے ہیں-------

سکول سے نکلنے کے بعد بھی مجھے اسے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے تھے۔ پارو کا گھر ہمارے مکان سے ذرا سے فاصلے پر تھا۔ بس درمیان میں چار مکانات چھوڑ کر پانچواں گھر ان کا تھا۔ حویلی نما اور عالی شان؛ بہت بڑا اور خوبصورت گھر تھا ان کا، بالکل خوابوں کی طرح۔ - - - پارو کی ماں ایک اچھی اور مہربان عورت تھی، زمیندار کی بیوی ہونے کے ناطے بستی کی اکثر خواتین ان کے گھر جاتی رہتیں۔ اماں جی کا بھی ان کے ہاں آنا جانا اکثر لگا رہتا۔ کبھی کسی کام کاج کے سلسلے میں طلبی ہوتی تو کبھی ویسے ہی وہاں کا چکر لگا آتیں۔ اکثر میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا اور وہاں پارو اور دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ پارو کے گھر دودھ بھی ہمارے ہاں سے جاتا تھا اور یہ ذمہ داری ایک طرح سے میرے سپرد کر دی گئی تھی۔ بڑا ہونے پر بھی میں ان کے ہاں دودھ پہنچانے جاتا رہا، اس دوران پارو بھی بڑی ہو گئی تھیں اور اس کا دلکش رنگ دروپ اور نکھر آیا تھا۔

پارو کے لئے میرے دل میں نرم گوشہ پہلے ہی جنم لے چکا تھا اور اب یہ جذبہ چاہت کا رنگ اختیار کر چکا تھا۔ اس یک طرفہ محبت کا

پتہ میں نے پارو کو لگنے نہیں دیا تھا- پارو اب بھی کبھی سامنے آجاتی تو مجھ سے بات ضرور کرتی مگر معاشرتی و معاشی فرق کی خلیج کافی وسیع تھی اور اس وسعت کو پاٹنا میرے دسترس میں نہیں تھا- پھر بھی ایک سپنا تھا، ایک خواہش تھی کہ کسی طرح پارو تک پہنچ پاؤں- ہمارا رسمی تعلق حدود و قیود کی چار دیواری سے نکل کر کبھی آگے نہ بڑھ سکا-

اب میں کافی بڑا ہو چکا تھا- بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا- پارو ہر وقت دل و دماغ پر چھائی رہتی- میری دلی کیفیت میرے والدین کی عقابی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی اور یہ بات ان کے لیے واقعی پریشان کن تھی- زمین نے آسماں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی، اتھاہ گہرائیوں اور کھائیوں نے بلندیوں کو چھونے کی خواہش کی تھی- والدہ نے دبے لہجے میں مجھے بار ہا سمجھانا چاہا ''باز آجاؤ لڑکے؛ قیامت آجائے گی اگر کسی کو پتہ چلا؛ زمیندار ہمارا جینا حرام کردے گا''-

مگر خود پر قابو میرے اختیار میں ہی نہیں تھا؛ بس ہر دم اسے ہی دیکھنے کی لگن تھی- معاملات کو سنگین دیکھ کر میرے والدین نے آپس میں سر جوڑ لیے اور خاصی غور و خوض کے بعد منطقی نتیجے پر پہنچے- ان کے پاس وقت بالکل بھی نہیں تھا ------!!!!

اگلی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مجھے کراچی کی گاڑی میں بٹھایا گیا جہاں میرے کوئی دور پار کے رشتہ دار پہلے سے موجود تھے- میں خاموش تھا؛ اف تک نہ کی اور کراچی جا پہنچا- چند مہینے کی سختیاں جھیلنے کے بعد مجھے ایک دفتر میں نوکری مل گئی اور مصروفیات کے جھمیلوں میں کھو کر میں وقتی طور پر پارو کو بھول گیا-

کراچی میں مسلسل تین سال گزارنے کے بعد میں چھٹی پر گاؤں چلا آیا- گھر والوں کے لیے قیمتی تحفوں کے ساتھ میں پارو کے لیے بھی نیلے رنگ کے کپڑوں کا دلکش جوڑا لے کر آیا تھا-

ٹرین سے اتر کر میں تانگے میں بیٹھا اپنی بستی کی جانب رواں تھا کہ بستی سے ذرا باہر رخصت ہونے والی بارات گاؤں سے نکل رہی تھی- بے شمار گاڑیاں اور براتی شور مچاتے ہمارے سامنے سے گذرنے لگے- تانگے کو سڑک کے ایک سائیڈ پہ روکے کوچوان نے معلومات دیتے ہوئے مجھے بتایا ''جلال بابو! اصل میں آج گاؤں میں زمیندار کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی، یہ ساری گہما گہمی اسی کی ہے؛ دیکھو شادی کی بارات جا رہی ہے''-

میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا؛ افسردہ نظروں سے بارات کی جانب دیکھا؛ پارو دلہن بن کر نیلے رنگ کی چمکتی کار میں گاؤں سے رخصت ہو رہی تھی.....

☆☆☆☆☆

''چاند مٹھی میں.....!!''

کرسٹینا! ہالی ووڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ رہی لیکن دولت کی انبار سے وہ اُکتا چکی تھی۔ کسی مذہب کو وہ نہیں مانتی تھی۔ سکونِ قلب جس کی تلاش میں سرگرداں وہ بھٹکتی چلی گئی-- پھر ایک دن اس نے شادی کرلی۔ افسوس پھر بھی سکون حاصل نہیں ہوسکا--- البتہ بے سکونی سے دامن بھر گیا اور تین سال کی شادی شدہ زندگی میں خاندان اور سماج نے بانجھ کا لقب سے نواز کر اس کی ذات اور انا کو مجروح کیا۔

اس نے دلبرداشتہ، شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی۔

انسانی زندگی، تشدد، مفلسی کے سبب پیش آنے والے مسائل اور ان کی حل تلاشی کے لیے دنیا کا دورہ کیا۔ پیسہ پانی کی طرح بہا کر لوگوں کی مدد اور ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی، سکونِ قلب پھر بھی دامن گیر نہیں تھا۔ تب اس نے فلم انڈسٹری کو خیر آباد کرتے ہوئے عرب ممالک کا رخ کیا، مصر پہنچی تو وہاں عجیب و غریب واقعہ نے اس کی زندگی ہی بدل دی شام کا وقت تھا-- سورج ڈوب رہا تھا۔

اچانک صحرائی آندھیاں اور ریت کا طوفان اٹھا تو سیاحوں میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی--- سنہری کرنیں ریت کی گرد میں مکمل ضم، چہار سو سرخ رنگ کے غبار نما بادل بناتے چلے جارہے تھے۔ آسمان یا زمین کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا--- بس دھول و گرد کا ہیولہ، سانس لینا مشکل ہورہا تھا-- کرسٹینا نے دوڑ کر ایک نہایت بوسیدہ گھر کا رخ کیا۔ دروازے پر ضرب لگانی چاہی جس کی ٹوٹی ہوئی دہلیز پر ٹاٹ کا پردا لٹک رہا تھا ---اندر سے فرحت بخش معطر جھونکوں کا احساس جیسے روح میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا--- اس نے دستک کا ارادہ ترک کیا اور بڑی آہستگی سے اندر داخل ہوئی۔ وہاں اس نے دیکھا ایک دبلا پتلا سا نوجوان اپنی ضعیف ماں کے گیلے بالوں کو تولیہ سے خشک کرتا ہوا برش کررہا تھا--- شاید وہ ضعیف العمر خاتون کو کچھ دیر پہلے غسل کروایا تھا۔ وہ بار بار جھلا کر بال بنانے سے انکار کرتیں تو نوجوان انھیں بڑے پیار سے شیریں لہجے میں مناتا ہوا برش کرنے لگتا--- جب اس نے بال بنا دیئے تو بڑے پیار سے بوڑھیا کا ماتھا چوما اور اپنے ہاتھوں سے انھیں کھانا کھلانے

ناہید طاہر

لگا-- ہر لقمے پر وہ منہ بناتی ہوئیں کھانے سے صاف انکار کر دیتیں--

''ماں--! چڑیا نے کھانا کھایا ایسے--''

''بلی نے کھایا ایسے --''

''چوہے نے کھایا---''

''ایسے--!''

اس بار ماں کھلکھلا کر لقمہ پر چھپٹ پڑیں--

عربی زبان کرسٹینا جانتی تھی اس کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے-

سوچنے لگتی آج کے دور میں کوئی اولاد اپنی ماں کی اس حد تک خدمت کر سکتی ہے بھلا--؟

بوڑھیا نے بڑی سعادت مندی سے کھانا ختم کیا تھا- نوجوان نے انھیں پانی پلا کر تولیہ سے منہ صاف کیا اچانک کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس کرتا ہوا وہ پلٹا-

سامنے کھڑی کرسٹینا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے--

''آپ--؟'' وہ نوجوان حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا

''معذرت خواہ ہوں--- میں بنا اجازت اندر داخل ہوئی -- دراصل باہر ریت کا طوفان--''

نوجوان نے بات کاٹتے ہوئے کہا-

''معذرت چاہ کر شرمندہ نہ کیجیے گا-- یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ میرے غریب خانہ تشریف لائیں--''

کچھ پل خموشی کے نذر ہوئے پھر وہ نوجوان گویا ہوا

آجکل پورے شہر میں آپ ہی کے چرچے ہیں--'' وہ کرسٹینا کی شہرت سے متاثر باہر جھانکا-- جہاں اس کے مداح کھڑے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے-

طوفان میں کچھ کمی آئی تھی

''ماں کی عمر جان سکتی ہوں؟''

کرسٹینا نے لبوں پر مسکراہٹ سجائے استفسار کیا

''ایک سو پانچ سال''

''ایک سو پانچ--؟''

حیرت سے کرسٹینا کا منہ کھلا رہ گیا

''ماشاءاللہ کہیں--- ورنہ نظر کا خدشہ ہوگا-''

نوجوان بڑی محبت سے ماں کو نہارتا ہوا کہا

جواب میں وہ شرمندگی سے ہنسی اور

''ماشاءاللہ'' کہا-

''کون ہے---؟''

ماں اپنی موٹی عدسوں کی عینک کے اوپر جھریوں بھرا ہاتھ کا سایہ بنا کر سوال کر رہی تھیں-

''ماں! یہ ایک امریکی سیاح ہیں---''

''اچھا-- مصر کی آثار قدیمہ دیکھنا چاہتی ہیں---''

اپنے سینے پر انگلی کا اشارہ کرتی ہوئیں وہ پُر مزاح لہجے میں کہتی ہنس پڑیں

''سو سوئیٹ---''

کرسٹینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی

''آپ سوچ رہی ناں؛

خاتون نے اس قدر لمبی عمر کیسے پائی--؟''

''سوچنے والی کیا بات ہے-- آپ کو اوپر والے نے حیات بخشی-- سو آپ زندگی کے مزے لوٹ رہی ہیں--''

کرسٹینا کے لہجے میں عقیدت چھلک آئی۔

''اس کم بخت نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے مکہ لے جائے گا---- کعبہ کا دیدار کرائے گا---بس اسی امید نے مرنے نہیں دیا--''

کچھ توقف بعد منہ بنا کر گویا ہوئیں

''کتنے سال گزر گئے اس کم بخت کی مصروفیات ختم ہی نہیں ہوتیں--؟''

''خاک مصروفیات--- میں ایک درماندہ، خستہ حال انسان-- مکہ کا سفر--- سوچ بھی نہیں سکتا۔''

اس نے نظریں چرا کر کہا تو کرسٹینا دونوں کی گفتگو سے محظوظ ہوئی

بوڑھیا جھلائیں

''پھر زندگی بھر خدمت کرتا رہ---ماں مرنے والی نہیں---دیکھ لینا--''

وہ بچوں کی مانند ضد کرتی ہوئی منہ پھلا کر اپنا چہرہ دیوار کی جانب پھیر لی

یہ پھر ناراض ہو گئیں--''

نوجوان اداسی سے کہا تو کرسٹینا زیر لب مسکرائی

دوسرے دن اس نے نوجوان سے ملاقات کی اور اس سے مکہ مکرمہ کی ٹکٹ کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کی اجازت طلب کی۔

''میں آپ سے پیسہ نہیں لے سکتا۔''

''کیوں--؟''

''کیوں میں کسی سے قرض یا ھدیہ قبول کروں--؟ جبکہ میری ماں کی دعائیں میرے ساتھ ہیں-- میں اپنی کمائی سے ماں کو مکہ لے جاؤں گا''

کرسٹینا کئی پل اس خودسر نوجوان کو دیکھتی رہی پھر اس نے سکریٹری سے اسی وقت اپائنٹمنٹ لیٹر تیار کروایا اور اسے اپنی کمپنی جو دنیا کی گنی چنی کمپنیوں میں شامل تھی مینیجر کی پوسٹ عطا کی--

''جو انسان دنیا کی سب سے مقدس رشتے کو اسقدر خوش اسلوبی سے نبھا رہا ہو تو وہ دنیا کے کسی کام میں غیر ذمے دار نہیں ہو سکتا---''

کرسٹینا نے متاثر کن لہجے میں کہا

کچھ ہفتوں بعد ایک دن اس نوجوان کا فون آیا تو کرسٹینا نے فوراً فون اٹھا لیا۔

''آپ کی ماں اب خوش ہیں--؟''

''جی ہاں-- وہ بہت خوش ہے-- ساتھ میں، میں بھی بہت خوش ہوں۔''

اچھا--!''

کرسٹینا ہنسی

''میری ماں نے میرے حق میں تین دعائیں کی تھیں--الحمدللہ دو دعائیں قبول ہو گئیں---اب تیسری دعا کے قبولیت کا شدید انتظار کر رہا ہوں۔''

تعجب کا مقام ہے-- کیا دعائیں اس قدر طاقتور ہوتی ہیں--؟

''بالکل--! آپ اگر اسلام کی اسٹڈی کریں تو پتا چلے گا کہ دعاؤں سے رب نے تقدیریں بدلی ہیں-
''پتھر سے چشمے بہا دیئے''
''آسمان سے من وسلویٰ نازل کیا''
''آگ کو گلزار بنا دیا''
جواب میں وہ ہونقوں کی مانند الجھتی استفسار کی،
میں کچھ نہیں سمجھی ---؟لیکن مجھے سمجھنا ہے--- بہت کچھ جاننا ہے---
کیا میں جان سکتی ہوں آپ کی ماں نے کیا دعائیں کی تھیں؟''
''جب بھی میں ان کی مکمل صفائی کرتا اور ان کی خواہش پر وضو کرواتا تو وہ مجھے دنیا و آخرت کی سرخروئی کی دعائیں دیتیں اور آخر میں یہ ضرور کہتیں: رب مجھے اپنے افسر بیٹے کے ساتھ کعبۃ اللہ کا دیدار نصیب کرے-''
''اوہ---اب تم افسر بن گئے ہو اور ماں کو عمرہ بھی کروایا''
''الحمدللہ''
''تیسری دعا جان سکتی ہوں--؟''
''بیٹا یعنی کہ میں! جنت کے اعلیٰ درجات میں اپنے والدین کے ساتھ داخل ہو جاؤں جہاں میرے بچوں کی چھوٹی سی فوج اور اس کی سپہ سالار پہلے سے میرا انتظار کر رہی ہو--''
مکہ مکرمہ سے واپسی میں نوجوان نے اطلاع دی کہ ماں کا راستے میں انتقال ہو گیا ہے- کرسٹینا اداس ہو گئی- پھر اس نے فلائیٹ سے وہاں پہنچ کر نوجوان کو حیران کر دیا
''ابراہیم--! میں اُس فوج کی سپہ سالار بننا چاہتی ہوں-''
بنا تمہید کے نہایت شائستگی اور ملائمت سے جب اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تو ابراہیم کی حیرت کی انتہا نہیں تھی- کرسٹینا پر ایک جہاں فدا تھا جس میں وہ بھی تو شامل تھا- وجود پر عجیب سا سحر طاری ہوا دوسرے ہی پل وہ کرسٹینا کی نگاہ شوق سے نظریں چُراتا گویا ہوا
''کافر کے لیے جنت میں کوئی جگہ نہیں--!''
جواب میں وہ زور سے ہنسی اس کی جلترنگ ہنسی دل کے بند دروازے پر دستک لگاتی محسوس ہوئی
'' افلورس---! سپہ سالار مسلمان ہی ہوگی- کائنات کی بہت سی نشانیاں ایسی ہیں جسے دیکھنے کے بعد اللہ کی ذات پر فخر محسوس ہوتا ہے--ان نشانیوں میں ایک تم بھی ہو---
کرسٹینا--! محبت بھی عجیب شے ہے اس کی کوئی حدود نہیں --- کوئی سرحدیں نہیں--- یہ خود ماورائی ہے-''
ایک ہفتے کے اندر ان دونوں نے شادی کر لی--- حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ شادی کے تیسرے ماہ بعد ہی کرسٹینا جس کی روح کو لوگوں نے بانجھ کے نشتر سے لہولہان کیا تھا وہ ماں بننے جا رہی تھی-

☆☆☆☆☆

انتظار او کیلنڈر (نائیجیریا فکشن)

اس کمرے میں جا بجا جالے لٹکے ہوئے تھے، ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ چھت کچھ ٹوٹی ہوئی تھی، دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی تھیں، فرش بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ ایک طرف رکھی الماری کا کافی حصہ دیمک چاٹ چکی تھی۔ غرض یہ کہ کمرے کی حالت انتہائی خستہ حال تھی۔ خاموشی میں ڈوبا وہ کمرہ کافی پُراسرار لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کمرے کے واحد رہائشی کے کھانسنے کی آوازیں آجاتی تھیں۔

ہشام اس کمرے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ وہ ہر چیز کو بغور جانچنے لگا۔ اسے کمرے کے واحد رہائشی سے تو انتہائی پُراسرایت محسوس ہوئی جو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے سامنے ایک میز تھی اور میز پر کیلنڈر رکھا ہوا تھا۔

''کون ہو؟'' بوڑھے واحد رہائشی نے اس کو دیکھا۔

''میں ہشام ہوں۔ قریبی کمرے میں مجھے کرایہ دار رکھا گیا ہے۔'' ہشام نے بتایا۔ اس کی نظریں بوڑھے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ گھر کے مکینوں کو پتہ چل گیا تو وہ تم سے ناراض ہوں گے اور مجھ سے بھی!'' بوڑھے نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا تو دیکھا کہ باہر سے دروازے کو کنڈی لگی ہوئی ہے، اسی دوران اندر سے کھانسنے کی آوازیں آئیں تو میں بے اختیار اندر چلا آیا۔'' ہشام نے مسلسل اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ بوڑھا بھی ویران نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟'' ہشام کے پوچھنے پر بوڑھا تلخی سے مسکرایا۔

''میں اس گھر کے مالکان کا باپ ہوں!'' بوڑھے کی آنکھوں میں بدستور ویرانی تھی۔

''کک..... کیا؟'' ہشام ہکلایا۔

''ہاں!'' بوڑھے نے کہا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ہشام حیران رہ گیا تھا۔

''انتظار!'' بوڑھے نے بتایا۔

''کس چیز کا؟'' ہشام نے ایک اور سوال کیا۔

بوڑھے نے سامنے رکھے کیلنڈر پر درج رواں مہینے کی اٹھائیس تاریخ کے ارد گرد گول دائرہ لگایا۔ ہشام نے دیکھا کہ گزشتہ تمام تاریخوں پر بھی گول دائرے لگے ہوئے تھے۔ ہشام کی حیرت بڑھ گئی۔

''میں یہاں کیلنڈر سامنے رکھے ہر ماہ کی کم تاریخ کا انتظار کرتا رہتا ہوں، کیونکہ کم کو میری پینشن آتی ہے۔ میرے بغیر وہ پینشن کیسے نکل سکتی ہے؟! میرے بیٹے مجھے کم کو اس کمرے سے لے جاتے ہیں اور میرے ہمراہ پینشن نکلوا آتے ہیں۔ ساری پینشن وہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ اس دن میں اپنے بیٹوں، بہوؤں، پوتے پوتیوں سے مل پاتا ہوں، ان کے درمیان بیٹھ سکتا ہوں، ان سے باتیں کرسکتا ہوں۔ وہ دن میرے لیے عید سے کم نہیں ہوتا۔'' یہ کہہ کر بوڑھا رُکا اور ہشام کو دیکھا، پھر مسرت بھرے لہجے میں کہنے لگا: ''آج اٹھائیس تاریخ ہے۔ یعنی تین دن بعد کم ہے!'' بوڑھے کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔

ہشام بھونچکا رہ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

سلمان یوسف سمیجہ

کھنکتے سکے [مائیکروفکشن]

"بھائی جان! کارڈ اسکین کیا ہے یا کرایہ نقد دو گے؟" سرکاری بس کا کلینر 25 روپے طلب کرتے ہوئے بھی 5 کا سکہ نہیں پلٹاتا، یہ کہتے ہوئے کہ نقدی کے ریزے وہ کہاں سے لائے۔ بٹوے کے تین چار خانوں میں کچھ سکے کھنک کر ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ بالآخر میرے ہاتھوں میں ایسا دھاتی ٹکڑا آ گیا ہے جس پر ملت کے رہنما کی تصویر گھس چکی ہے اور اس چھوٹے سے ریزے پر بمشکل ہی ایک روپے کی مقدار پڑھی جا سکتی ہے۔ میں 5 کے روپے کے فرق کو در خور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے دس روپے کے تین نوٹ بس اٹنڈنٹ کو تھما دیتا ہوں۔ کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے، میں چوک پر اترا تو دھوپ سروس روڈ پر پھیلی ناجائز طور پر متجاوز دکانوں، ہوٹلوں اور چائے خانوں کے اندر گھسنے کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ یہاں کے قبضہ مافیا نے سڑک اور اس حصے کے درمیان میں جو حفاظتی دیوار بنا رکھی ہے اس کی کم پڑتی چھاؤں کی آڑ لے کر بھی کچھ ریڑھی والے مشروبات بیچتے نظر آ جاتے ہیں۔

"بھیا! ایک گلاس لسی کا تیار کر دو"

میرے بٹوے کے خانوں کے درمیان کہیں بھی کوئی دس روپے کا الگ سے نوٹ نہیں بچا۔ میں نے ایک گلاس لسی کی قیمت ادا کرنے کے لیے پھر سے بٹوا ہلا کر سکے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ ٹھن ٹھن کرتے ادھر اُدھر ہو گئے اور صرف ایک پانچ کا سکہ ہاتھ میں آ گیا

"چھوڑ جناب! پچاس ہی دے دو، پانچ روپے کی کیا بات ہے!"

وقت اب کچھ کم ہی بچا ہے اور لسی پینے سے طبیعت کو جو تازگی حاصل ہوئی ہے وہ کام پر پہنچنے تک تو میرا ساتھ نبھاے گی ہی۔ نہیں تو یہ مزاج بے آواز طریقے سے بکھر جاتا ہے۔ سکوں جیسی کھنک بھی نہیں سنائی دیتی۔ طمع کے ریزوں میں کہیں آ کر سمٹ گئے ہیں جو اسے جہاں ہیں دکھانے کی تنگ وردی میں ہیں۔ یہ زمانہ سازی یہ جہاں داری کئی گرتے کاغذی بنک نوٹوں کو پانے کی لاحاصل چاہ کے تعاقب میں ہے اور اس میں حقیقتاً دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ جب ہمارا ایک ہم مکتب میلی کچیلی اور بدرنگ وردی میں مدرسے آتا تھا، وہ اپنے دہاڑی دار باپ کی تڑول سے بچ کر اور ماں کے پیچھے چھوٹے ناز اور نخرے کے زور پر بھی دو روپے کا تازہ نوٹ نکال لاتا تھا تو اسے اپنی مٹھی ایک روپلی بے بس اور صاف ستھری جیب میں مارے ٹھنڈ کے بھی ہاتھ نہیں تھمایا جاتا تھا۔ تب پانچ اور دس کی قدریں بعید از خواب تھیں۔

"یہاں تک آنے کے ساٹھ بنے نا؟"

"جی" موٹر سائیکل رکشہ کے ڈرائیور نے جواب دیا۔ میں نے بٹوے میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا

"10 روپے کا نوٹ ہو گا آپ کے پاس؟" رکشہ ڈرائیور نے میری طرف پچاس کا نوٹ بڑھایا

"نہیں یار! ---ایک منٹ! دو چمکتے ہوئے پانچ کے سکے ابھی بٹوے میں نظر پڑے تھے۔"

میں بٹوا یوں ٹٹولتا ہوں جیسے کوئی دہقانی بڑھیا چھاج میں گندم کے دانے اچھالتی ہے مگر ہلکی سی کھنک کے ساتھ سکے خانوں کے درمیان یہاں وہاں بھاگ جاتے ہیں۔ شاید یہ اس لیے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں کہ 5 روپے کی ایک ایک کھنک میں معصوم خواہشوں کی وہ چنگی سمٹ گئی ہے جو زندگی کے الگوردھم میں ٹوٹی پھوٹی نظر آتی ہے۔

"کوئی گل نہیں بھیرجیا!" رکشے والے نے آج مجھے دس روپے کا نفع دے کر اگلے اسٹاپ کی طرف جانے کے لیے کک لگائی۔

☆☆☆☆☆

سید محمد آصف مہدی

دعا

معصیت اور گناہوں سے بچائے رکھنا
عزت، احباب کی آنکھوں میں بنائے رکھنا

مجھ خطاکار کی درماندگیِ حشر میں بھی
آبرو رکھنا، مری ساکھ بنائے رکھنا

سفرِ آخرت آساں ہو مرا جن سے، مرے
سر پہ اشجارِ بہشتی کے وہ سائے رکھنا

ساری عزت ہے اسی در کی زمیں بوسی میں
اُس کی دہلیز پہ اپنے کو گرائے رکھنا

ربِ ارحم ہے وہی اُس کے کرم کے بارے
خوش گمانی کے دیے دل میں جلائے رکھنا

رحمتِ ایزدی اُترے گی ثنا کی صورت
سعیِ تخلیق میں دل اپنا لگائے رکھنا

اُس کے احکام ہیں ہر پہلو سے حرفِ آخر
عبث اِس باب میں اپنی کوئی رائے رکھنا

اُس کی ہستی کے حضور اپنا عقیدت سے ریاض
سر جھکائے ہوئے، ہاتھوں کو اٹھائے رکھنا!

ریاض مجید

جبرِ سعید

فطرت کی اندھی تقلید
پَسُو کرتا ہے
انساں اپنی مرضی ساتھ
قدم دھرتا ہے
لیکن یہ مٹی کا پتلا
چاہے بھی تو
پوری طرح سے
نا انسان
نہیں ہو سکتا
کُل شیطان نہیں ہو سکتا
تم بے چین بہت ہو
واپس جنگل سمت نکل جانے کو
اپنے حسابوں
اپنا اصل پتا پانے کو
اندر سویا وحشی
پھر سے جاگ گیا ہے
جاؤ جاؤ جم جم جاؤ
اپنی پگلتا کو بہلاؤ
لیکن اتنا یاد رہے
صدیوں کے سفر میں
ساتھ تمہارے
چل کے یہاں تک جو آیا ہے
بہت دنوں اب
تم کو اپنے
پیچھے چھوڑے غاروں میں
رہنے نہیں دے گا
آٹھ پہر کا دہشت پن
سہنے نہیں دے گا
سوچ ندی کو
الٹے رخ بہنے نہیں دے گا

جلیل عالی

جانے والے سال کے لیے ایک نظم

دشتِ جاں میں اکیلا
پھروں کب تلک
دشتِ جاں میں
دلِ مضطرب کی تڑپ

خواب جتنے بھی تھے
خاک میں مِل گئے
خواہشوں کا الم
دامنِ چاک پر
رقص کرتا رہا
جاں مچلتی رہی
دل سنبھلتا رہا
بس یہی داستاں
تھی مِرے شوق کی
جس کا آغاز ہی
اس کا انجام تھا

شب کی تاریکیاں
اور یہ اندھا سفر
ختم ہو کب تلک
کِس کو معلوم ہے
اے دلِ بے خبر!!

سید افسر ساجد

صفورہ ابھی منتظر ہے

یا بنی اسرائیل!
جانتا ہوں، تری مظلوم غلامی کے دنوں کا احوال
دیکھتا ہوں، تری محکوم تمناؤں کا آفت زدہ حال
یا بنی اسرائیل!
ابھی کچھ روز ٹھہر! جانتا ہوں
انتظار ایک مصیبت ہے مگر صبر کی طاقت
ہے مصیبت سے بڑی
اس قدر جلد مصیبت کا مداوا نہیں ہونے والا
ابھی قبطی کوئی مقتول نہیں ہے
مگر اولادِ یہودا میں ہزاروں کا لہو ہو بھی
چکا خاک میں جذب
کٹ گئے کتنوں کے سر اور ہیں کتنے ابھی گردن زدنی
ابھی سینا سے وہ اترا نہیں نورِ سحر افروز کہ موسیٰ
ابھی فرعون کے چنگل میں ہے
ابھی مدین کی حسیں دختِ شعیب
اپنا مشکیزۂ آبی بھر کر
لوٹ جاتی ہے کنویں سے ہر روز
منتظر ہے ابھی دوشیزہ صفورہ کا سہاگ اپنے
سہاگی کے لیے
کوہِ حورب کی حسیں وادی میں آیا نہیں گلے کو چرانے والا
یا بنی اسرائیل!
رعمسیس اپنے محل میں ابھی سانسوں کا شمار ندہ ہے،
بس آخری سانسوں کا شمار ندہ ہے
وہ عصا جس سے دہل جائے دلِ نیل، ابھی
منقا جی غم و غصہ کی شقاوت زدہ آنکھوں سے اترتا ہوا
سفاک ارادوں کے بم و زیر میں لہراتا ہے
بامِ سینائی سے ہو کر نہیں آیا یدِ بیضا کی مثال
ابھی فرعون کے بے مہر تسلط میں ہے
ابھی خوش خواب نگاہوں میں جو اُترتی ہے چمک
جاگ اُٹھی ہے جو تعبیر کی لہر
بے اثر ہے
کہ ابھی ٹوٹا نہیں ضربِ کلیمی کا سپہر
اور اُبھرتی ہے اگر کوئی صدا
خونِ مظلوم کا مقتل کو بہت نشہ ہے
یا بنی اسرائیل!
جانتا ہوں، تری مظلوم غلامی کے دنوں کا احوال
دیکھتا ہوں، تری محکوم تمناؤں کا آفت زدہ حال
اس قدر جلد مصیبت کا مداوا نہیں ہونے والا
ابھی خاموش کلیمی ہے، صفورہ بھی ابھی منتظرِ فردا ہے
ابھی چپ چاپ سروں پر وہی افلاک کا بے مہر
سر اپردا ہے

خالد علیم

بدن کے راز

مجھے تنہا ہی رہنا ہے

تجھے تنہا ہی رہنا تھا تو تاریکی ہی بہتر تھی

یہی میرا مقدر تھا تو پھر یہ روشنی کیوں تھی؟

مرے دل میں طلب کے خواہشوں کے رنگ کیوں آئے؟

تجھے تنہا ہی رہنا تھا

تو میری اُنگلیوں کو لمس کا اِحساس کیوں بخشا؟

زباں کو گرم ہونٹوں سے پگھلنا،

آنکھ کو مسحور ہونا کیوں سکھایا تھا؟

بدن کا راز جب تک راز تھا

پتھر تھا

جسموں کی حرارت سے تبھی

میں پانیوں کے راستوں میں بیٹھ کر کہتا

''نہ جانے کون سے پتھر ہیں

جو پانی کے دھارے پر پڑے کٹ کٹ کے بہتے ہیں''

بدن کے راز نا معلوم تھے تو مَیں

ہوا تھا، تیرتا تھا بس خلاؤں میں

سمندر کے بھنور میرے لیے تب اجنبی تھے

سوچتا تھا، کون ہیں

جو موتیوں کی آرزو میں ڈوبتی گہرائیوں کے راز پاتے ہیں؟

فیاض تحسین

ہوا دستکیں دے رہی ہے

.....ہَوا دستکیں دے رہی ہے
ذرا بڑھ کے دروازہ کھولو، کہ اب
موسمِ حبس رخصت ہُوا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل پڑی
ہر کلی کھل اُٹھی
زندگی کھل اُٹھی

کیا عجب بات ہے
کیا عجب رات ہے
آج تارے زمیں پر اُترتے چلے آتے ہیں
دُوریوں کے سبھی زخم بھرتے چلے جاتے ہیں
روشنی اِس قدر بڑھ گئی
قربتیں جگمگانے لگیں
رہروانِ محبت کو جیون کا رستہ
دکھانے لگی ہیں
انیسِ دل و جاں!
یہی ہے وہ اک ساعتِ جاوداں،
جس کے دامن میں
راحت ہے،
چاہت ہے اور پیار ہے
آؤ، دونوں
اسی ساعتِ جاوداں میں
محبت کی اس رہگزر پر دھریں
اپنا پہلا قدم
اور
گلابوں سے بھر دیں
دیارِ طلب!!

(محمد سدیم ارشد کے نام)

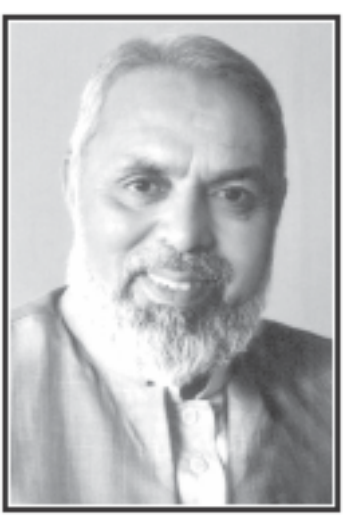

محمد انیس انصاری

اہم ہونے کا وہم

حباب کے محیط میں
مری انا الجھ پڑی
ذرا سے اک مذاق سے.....

خلا کے اس بسیط میں
ذرا سا تین فیصدی مواد کا جو یہ غبار ہے
بڑی سی دوربین سے
کبھی تلاش نا مجھے
غیاب کے عمود میں
سمے کی یہ جو موج ہے
اور اس میں تیرتے ہوئے
جو اَن گنت حباب ہیں.....

نہیں ملوں گا کھوج سے.....

غیاب کے اِدھر اُدھر
کہیں کسی حباب کے محیط میں
زمیں کو روندتا ہُوا بڑے ہی طمطراق سے.....

ملوں گا اتفاق سے.....

جن دنوں کا سنی تھی ہوا

جن دنوں کا سنی تھی ہوا
ہم نے
پیلے دوپٹے کے بارے میں
جو کچھ لکھا
وہ کسی کو سنایا نہیں
دید کے سبز موسم میں
پلکوں تلے
کونسے پھول کھلتے تھے
کتنے ستارے دمکتے تھے
ہم نے کسی کو بتایا نہیں
لوگ کہتے تھے سہنے سے اظہار بہتر ہے
پر آزمایا نہیں
صورتِ اشک شانے پہ سر رکھ کے
غم کو بہایا نہیں

یہ الگ بات ہے
پردہ داری کے اس کھیل میں
کچھ بھی پایا نہیں!

منظر اعجاز

کوئی تو صورت ہو

کوئی تو صورت ہو
کہ میری بستی میں
دہائیوں سے چھائے ہوئے
وحشت کے سیاہ بادل
چھٹ جائیں
اور دِیوار سے لگے
نحیف و ناتواں لوگوں کے سہمے ہوئے
چہروں پر خوشیاں لوٹ آئیں
کوئی تو صورت ہو
کہ ہم لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے
اپنے گرد بنائے
اناؤں کے آہنی حصار کو توڑتے جائیں
کوئی تو صورت ہو
کہ بستی کے اندھیاروں میں
اُمید کے چراغ جلیں
نفرتوں کے دیس میں محبتوں کی بات ہو
ہونٹوں پر مسلط ہوئی
طویل خموشی کے سربستہ راز کھلیں
وطن سے عام ہوتی ہجرتوں کا دور بھی تمام ہو
گھٹن کا یہ طویل دور بھی ختم ہو
اور عقل کے بند کواڑ کھل جائیں
کوئی تو صورت ہو

طلعت شبیر

مرا دل چاہتا ہے.....

مرا دل چاہتا ہے
میں زمانے بھر کے دکھ
کاندھوں پہ اپنے لاد کر
دریا میں پھینک آؤں

مرا دل چاہتا ہے
میں مسائل سے بھرے
اس شہر کے
لوگوں کے سب غم دور کر دوں
جھولیاں خوشیوں سے بھر دوں

مرا دل چاہتا ہے
میں کسی کی آنکھ میں
آنسو نہ آنے دوں

مرا دل چاہتا ہے
ظلم کرتے وحشیوں کو
موت کی ان وادیوں میں پھینک دوں
جن میں جہنم ہو

مرا دل چاہتا ہے
میں فلسطیں کے شہیدوں کو
کھلی آنکھوں سے دیکھوں
جنت الفردوس کے اندر
اور دوزخ میں مجھے ان کے سبھی دشمن
نظر آئیں

مرا دل چاہتا ہے
اب کسی لمحے
فلک سے حضرتِ عیسیٰ اتر آئیں

مرا دل چاہتا ہے
میں وہ منظر دیکھ لوں
جو دیکھنا بس میں نہیں میرے
مرا دل چاہتا ہے
کیا کروں
خواہش تو رکھتا ہوں

محمد نوید مرزا

گڈ ٹو سی یو صنم

تیرگی کاٹ کر دید کی روشنی
مضمحل ہجر کی چیخ تھی دل نشیں
آنکھ پرنم بھی تھی اور تھی شبنمی
عین مفہوم تھا!!!!
گڈ ٹو سی بے وفا

یعنی تم میرے دل کے مکیں تھے کبھی
میرے ہر راز کے تم امیں تھے کبھی
اب جو کنکر سے چبھتے ہو آنکھوں میں تم
انھی نظروں میں بن کر ستارا رہے،
اس چمکتی ضیا کا نگیں تھے کبھی

تھے منقش حسینوں کے سجدے جہاں
ایسی محراب سی سرزمیں تھے کبھی

وہ سرابوں سی دھند اور صحرائے دل
ماتمی سا محل!!!!
آرزوئے مَدِل!!!
بزدلی کی روایت میں ظرفِ وفا؟
مستند تھا کہیں؟
خوف میں تھے نہاں، سب یہیں تھے کبھی
آنکھ میں نم جو دیکھا تو اچھا لگا
اس یقیں سے تو تم بے یقیں تھے کبھی

خیر گزری کہ لمحے سمٹنے لگے
تم اسیرانِ وحشت میں شامل کہاں
ہم کہ وہ، وقت کی سرزنش سے جو غافل رہے
ہم چراغ تمنا جبیں تھے کبھی
دل ہی دل تھے کبھی

تم ہو جس جا ابھی، ہم وہیں تھے کبھی
جاؤ تم ہو بری اور سبکدوش بھی
جرم و الزام سے
خانۂ دل میں اب تم مقید رہو، کہ یہیں تھے کبھی
دل کی اک ہی ردھم
گڈ ٹو سی یو صنم

سعدیہ بشیر

دکھ کے موسم دائمی ہوتے ہیں

کہیں چلے جائیں روح شانت نہیں ہوتی
من گھائل ہی رہتا ہے
اداسیاں اوڑھ کر خوش رہنے کا ناٹک کرتے رہتے ہیں
لہجے سے آنسوؤں کی باس نہیں جاتی
مردہ وجود خواہشوں کے مرقد پر
انتم سنسکار کا منتظر ہے
سفر میں اکیلا چھوڑ جانے والے
پھر پلٹ کر نہیں دیکھتے
خود کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتارنا
مشکل ہے
مگر ناممکن نہیں
خود کو الوداع کرنے کی رسم
خود بھی نبھائی جا سکتی ہے
دکھ کے موسم دائمی ہوتے ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھیں خوشبو کی طرح اُٹھ کے بکھر جاتی تھیں
جانے کس موج میں وہ جانِ صبا اپنا تھا

رائیگانی کا سیلاب

ہم سے
کچھ بھی نیا نہیں ہوتا
وہی
گھسے پٹے
مسائل کی ریڑھی ہانکتے
ردی جیسے لوگ
کچھ مداری
سیاست کے بازار میں
رنگ برنگے تماشے کرتے
ہمیں گلیوں، بازاروں میں روز ملتے ہیں
کوئی ہمارے
خوابوں کا زیور چُرا کر
وطن سے دُور بھاگ جاتا ہے
کوئی ہمیں
اذیت کے تسموں سے باندھ کر
کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے
ہمارے حصے میں
محبت کی قدیم یادکا اہرام
بوسیدہ وصل کے چند ٹکڑے
بے کار زندگی کے فرسودہ قصے ہی آتے ہیں
جنھیں آج کی زندگی
متروک لفظوں سے بھرے لغت میں دیکھتی ہے
ہم رسک لینے
اعتماد کرنے کی غلطی سے ڈرتے ہیں
ہمارے ایمان
زنگ آلود دریا کی سیاہی میں ڈوب گئے
جیسے ہمارے خواب
دسمبر کے آخری دنوں کے ساتھ
محبت کی سرزمین میں دفن ہو گئے

امجد بابر

حمدیہ نظم

حمد کیونکر بیاں ہو تیری
ڈبیا جتنی ہے لغات میری
عقل کی چٹکی بھر پونجی
سوچ کی بالشت بھر رسائی
اور کروں ثناء رب دو جہاں؟
دو جہاں بھی کہاں؟ جانے کتنے جہاں
ماوراء ماسوا مابعد از بعد
ہزار ہا موجودات
ارضیات
فلکیات
رکتی ہی نہیں کہیں پہ بات
خود خدا نے کہہ دیا قران میں
'' کہہ دو اگر سمندر میرے رب کے
کلمات (لکھنے کی) کی سیاہی ہو
سمندر ختم ہو جائیں کلمات ختم نہ ہوں''
اے رب کائنات
ترے تخلیق کردہ ان گنت کرات
ان گنت کرات میں مٹھی جتنا ایک کرہ
مٹھی جتنے کرے پہ بیٹھی اک کیڑی (چیونٹی)
کیڑی کو کیا ادراک کیا فہم و شعور
کیڑی بولے ہر دم بولے بس یہی بولے
تو رب ہے
تو سب ہے
تو رب ہے
تو سب ہے

دردانہ نوشین خان

کھڑکیاں

اپنی آرزو کی کھڑکی میں کھڑا
دیکھتا ہوں دنیا کو
کئی کاش لبوں پر آئے جاتے ہیں
میں پریشان ہوں
سوچتا ہوں
یہاں کتنی تفریق ہے
پچھتاوا لیے
آہ بھرتا ہوں
میرے خواب ٹوٹ گئے ہیں
اور میں
ان کی کرچیوں پر
ننگے پاؤں چل رہا ہوں
تھکا تھکا، بے چین
نڈھال جسم لیے
پھر میں سوچتا ہوں
یہ آرزوؤں کی کھڑکی
کیا کبھی بند بھی ہوگی
شاید نہیں
اک نئی آرزو کی کھڑکی کھول کر
نئے سرے سے نظارہ کرتا ہوں
کئی ادھ کھلی کھڑکیاں
پیچھے چھوڑ آیا ہوں
کئی نئی کھڑکیاں
کھلنے کے انتظار میں ہیں

محمد کلیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہرِ عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصارِ فکر سے باہر نکل کے آ

اک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

تُو وہاں کیسی ہے؟ مجھ کو، کیا بتائے گا جہاں
کیسے تیری یاد پھیلی، ہر گلی اور ہر مکاں
چاہتا ہوں پھول بھیجوں، پر تجھے کیسے وہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

غم کے بادل آ گئے ہیں، اب بھلا کیسے چھٹیں
ہجرتوں کی زد میں آ کر رات دن کیسے کٹیں
فاصلوں کی مٹھیوں میں آ گئی ہے داستاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

زندگی سے حسرتوں کا ساتھ کیسے چھوڑ دیں
ہم امیدوں کے شجر سے پھول کیسے توڑ دیں
دیکھو تنہا رہ گئی مونا وہاں، اور میں یہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

مجھ کو اب تک تیرے وعدے تیری قسمیں یاد ہیں
چاہتوں کے دم سے میرے سب جہاں آباد ہیں
اب تری آہٹ نہیں ہے، جس سے کھولوں کھڑکیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

راحتوں نے آنکھ کھولی کس طرح ہنستے ہوئے
ہر نظر پتھرا گئی ہے راستہ تکتے ہوئے
اب یہاں ملتے نہیں ہیں، تیرے قدموں کے نشاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

تو گئی تو ساتھ اپنے، ہر خوشی ہی لے گئی
وقت کی دہلیز پر اک نا اُمیدی دے گئی
بے بسی سے دیکھتا ہوں میں زمین و آسماں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

وہ گئے دن کی مسافت ساتھ چلنے کا جنوں
ایک لمحے کی جدائی، چھن گیا میرا سکوں
رہ گئی ہیں ساتھ تیری یاد کی پرچھائیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

برتھ ڈے مونا مبارک، اے مری جانِ وفا
اب اگرچہ کٹ گیا ہے گفتگو کا سلسلہ
سب در و دیوار، آنگن ہو گئے ہیں بے زباں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

ہر مسرت، ہر خوشی، ہر اِک تمنا، آرزو
نا امیدی کے سفر میں کھو گئی ہے جستجو
دوریوں میں کھو گئی ہے زندگی کی کہکشاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

میں نے سوچا ہی نہیں تھا اس طرح ہو جائے گا
سارا رستہ دو قدم کے بعد ہی کھو جائے گا
چہچہاتے گلستاں میں، ایک سونا آشیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

لمبی شامیں رہ گئی ہیں میرے جلنے کے لیے
دن ملے ہیں مجھ کو اب تو ہاتھ ملنے کے لیے
مولا، کتنا رہ گیا ہے؟ زندگی کا امتحاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

اک تڑپ رہتی تھی تجھ کو مجھ سے ملنے کے لیے
ہم سفر جس کو چنا تھا ساتھ چلنے کے لیے
اب تو تیری یاد میں ہی بس رہا ہے یہ جہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

پھول پتے چاند تارے یاد کرتے ہیں تجھے
راستوں کے پیڑ سارے یاد کرتے ہیں تجھے
تیری یادیں، تیری سوچیں، تیرے سپنے جانِ جاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

تیری جانب قافلوں کا راستہ چلتا نہیں
جاگنے تک یاد کا سورج کبھی ڈھلتا نہیں
اب فضا میں پھیلتا ہے ناامیدی کا دھواں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

میرے سر سے دور ہے اب راحتوں کا سائباں
دیکھ کر کیسے میں چلتا تیرے قدموں کے نشاں
آرزوئیں کر رہی ہیں میرے دل کی دھجیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

نقش ہے دِل پر مرے عمّار کی ایک ایک بات
دور ہے وہ مجھ سے پر، اب بھی ہے میرے ساتھ ساتھ
اُس کی یادوں کے اُجالوں سے ہے روشن یہ مکاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

ساتھ وہ تنہائی میں ہے، راز کی یہ بات ہے
لگتا ہے کہ ہر قدم پر میرا بیٹا ساتھ ہے
فاصلوں میں قربتیں ہیں، قُربتوں میں دُوریاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

مونا اور عمّار دونوں ہی اُثاثہ ہیں مرا
رشتے تو باقی رہے، ٹوٹا رہا پر رابطہ
بے سہارا کھینچتا کیسے؟ وہاں تک بادباں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

مونا اور عمار بے شک ہیں مرے گھر کے مکیں
دنیا والوں کو مگر، دونوں نظر آتے نہیں
دم قدم سے ان کے ہی آباد ہے میرا جہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

رب العزت تجھ سے میری ایک یہ بھی ہے دُعا
رکھنا اِن پر گرمیوں کی دھوپ میں سایہ گھنا
میں کہوں پر تُو یہ مت کہنا اے ربِ دو جہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

کیا کہوں عمار کی ہر اِک شرارت یاد ہے
مونا نے جتنی لڑائی ہے محبت یاد ہے
میں بھی جی اُٹھتا ہوں اب تو یاد کر کے شوخیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

عید اور تہوار بے شک، اب بھی آتے ہیں مگر
پیار میں کرتا ہوں جن سے، وہ نہیں آتے نظر
کس سے پوچھوں دور کیسے ہوں مری تنہائیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

دیکھنے، تو جا بسے ہیں دونوں مجھ سے کوسوں دور
مونا ہے دل کا سکوں، عمار ہے آنکھوں کا نور
ختم کب ہوں گی، خدا جانے مری بے تابیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

گھر کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں اکثر رات بھر
ملنے کو شاید چلے آئیں وہ، مجھ سے اپنے گھر
عید سے پہلے ہی ہوگا، عید کا گھر میں سماں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

جب بھی ہو ممکن چلے تم آؤ، دونوں میرے پاس
کہہ رہی ہے میری آنکھوں کی نمی، دل ہے اداس
دور ہو سکتی ہیں، یہ دونوں طرف کی دوریاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

مونا اور عمار کا رہتا ہے ہر دَم انتظار
جا چکا پت جھڑ، نظر آنے لگے رنگِ بہار
تم بھی لوٹ آؤ تو اب لوٹ آئیں گی رعنائیاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

دور ہو نظروں سے یوں دیدار کر سکتا نہیں
پیار تو کرتا ہوں میں، اظہار کر سکتا نہیں
کیا کہوں؟ ہے بے زبانی جانِ من میری زباں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

دُوریاں تو مجھ سے ہو سکتی نہیں مولا، عبور
بخش دے میری خطائیں اے مرے ربِ غفور
پھر سے تُو آباد کر دے، یہ مرا اُجڑا جہاں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

ہے سمندر پار انجم میری منزل کا نشاں
سامنے ہیں مونا و عمار، ملتے ہیں کہاں
ہو گیا ہے کارواں سے دور میر کارواں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

ہے سمندر میں سفینہ، دور تک ساحل نہیں
مولا تُند و تیز موجیں تو مری منزل نہیں
الامان و الحفیظ، الحفیظ و الاماں
اِک سمندر درمیاں ہے، اِک سمندر درمیاں

سید انجم معین بلے

زندوں کے جنازے

مَرے ہوؤں کے جنازوں پر تو سب آتے ہیں
پچھتاوے کا بوجھ اُٹھائے
رونے پیٹنے
اک دوجے کو پُرسہ دینے
اور کچھ شاید اوروں کو دکھانے
رشتوں پر احسان جتانے
کیونکہ دفنانے کے بعد
بٹوارہ بھی کرنا ہوتا ہے
بچے کھچے اسباب کا
اور اُن مخلص رشتوں کا
جنہیں مٹانا ہوتا ہے
منظر سے ہٹانا ہوتا ہے
ورنہ کون کسی کو روتا ہے

لیکن کچھ زندہ بھی مُردوں جیسے ہوتے ہیں
جنھیں زمانہ وقت سے پہلے سُولی پر لٹکا دیتا ہے
اپنی لاش اُٹھا کر وہ پھرتے رہتے ہیں
اپنے ہی کاندھوں پر
اپنا پرایا کوئی نہیں آتا اُن کی لاش اُٹھانے
اُن کے جنازے کو کاندھا دینے اور اُنہیں دفنانے
جیتے جی وہ مَر جاتے ہیں لوگوں کے
سفاک رویوں کے ہاتھوں
کوئی پُرسہ بھی اُنہیں دیتا نہیں ہے

اک قبرستان چھپائے پھرتے ہیں جو سینوں میں
خود کو دفنائے پھرتے ہیں جو سینوں میں

کاش! اذیت دینے والے بے حس لوگ
مَرے ہوؤں کا ماتم کرنے سے پہلے
زندوں کی بھی قدر کریں
اپنی جھوٹی انا کے خول سے باہر نکلیں
سچے رشتوں کو پہچانیں
اُن کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرنے کبھی آجائیں
زندہ لاشوں کو بھی دفنانے کا بندوبست کریں!
اُن کے آنسو دینے والے
اُن کے بھی آنسو پونچھیں
بھلے دکھاوا ہو اِس میں
اتنا تو احسان کریں
زندوں کو حیران کریں

ظہور چوہان

مگر ایک شاخِ نہالِ غم

(موت سے چند روز پہلے لکھی گئی)

محبت کی ہری کونپل لرزتی تھی، تو کہتے تھے
نگاہِ بد ہمارا کیا بگاڑے گی!
ہوا کا گرم جھونکا، پیلی آندھی، سبزۂ دل پر
اداسی کی سیہ چادر بچھا بھی دے تو شادابی
سیاہی میں بھی اپنا سر نکالے گی!
کوئی ساتھی سناتا داستانِ غم تو ساری بات جیسے اجنبی ہوتی
تر و تازہ شگفتہ خواہشوں میں دکھ کا افسانہ
کتابی واقعہ لگتا، اور اس کی سوگواری بھی
اداکاری نظر آتی
وہی دنیا، وہی ساتھی، وہی محفل، وہی میں ہوں
وہی میں ہوں کہ اب خود ذات کا آشوب لکھتا ہوں
سناتا پھرتا ہوں اپنی کہانی کونے کونے کو
محبت کی ہری کونپل جھلس کر منہ چڑاتی ہے
تو سارے دوست مل کے تعزیت کو جمع ہوتے ہیں
میں جب آنسو بہاتا ہوں تو سب اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
اور دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہیں
خدایا اس برے انجام سے سب کی حفاظت کر
جوانی کے نشے میں جھومتی ٹہنی، سنہری پتیوں کو
خود فریبی کی ہواؤں سے بچائے رکھ!
خداوندا! اگر وہ، خوبصورت دن، حسیں راتیں
رفاقت کے وہ خواب آگیں مناظر خود فریبی تھے
تو اس سے پیشتر جادو کی یہ شیشہ گری ایسے چٹختی
آنکھ مُند جاتی تو اچھا تھا
یہ دل سینے سے ٹکرا کر ٹھہر جاتا تو اچھا تھا
جوانی پر یہ کالی ساعتیں آنے سے پہلے
خود جوانی راکھ ہو جاتی تو اچھا تھا

انوار انجم

ساون

آسماں کی بلندیوں پہ چلنے والے بادل
اور فضا نکھر گئی

میرے آنگن پہ رک گئے،
دھنک کے سات رنگ بکھر گئے

اک طرف رم جھم ہوئی
نجانے حبس اور لُو کے قافلے کدھر گئے

اک طرف سے بادل اُٹھے
کلی کلی مہک اٹھی

پھول مسکرائے
گلوں پہ رنگ چھا گئے

پتے لہرانے لگے
سبھی کے دل مچل اٹھے

آسمان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے
فضا پہ رنگ چھا گئے

اور زمین میں سما گئے

صحرا کی پیاس بجھ گئی

ہوا میں آئی تازگی

ہادیہ بتول

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

وہی مٹی، وہی پانی

نوید صادق

۔۔۔مگر موسم خفا مجھ سے
عناصر مجھ سے نالاں ہیں
خدا معلوم
مجھ سے چاہتے کیا ہیں
کہیں مٹی،
کہیں پانی،
کہیں کچھ بھی نہیں ہے
میری دائیں سمت
یاد آیا
بہت پہلے کہیں پانی، کہیں مٹی
۔۔۔مجھے کچھ یاد آئے تو بتاؤں
کون ہوں؟ کیا ہوں!
وہی مٹی، وہی پانی کا جھگڑا ہے
اور ان کے بیچ، بیچوں بیچ

سبھی موسم خفا مجھ سے
عناصر مجھ سے نالاں ہیں!

سن 2025 کا جدید ترین خطاب

اعجاز رضوی

اے بوسیدہ خیال لوگو
مجھے بینک اور موبائل میں رہنا پسند ہے
دل میں رہنا
ایک بوسیدہ خیال ہے
دل تو مر جاتا ہے
بینک اور موبائل کبھی نہیں مرتے
مشکل وقت میں
بینک اور موبائل میں رہنے والے
منتقل ہو جاتے ہیں
مگر دل میں رہنے والے کبھی منتقل نہیں ہوتے
مجھے منتقل ہونا پسند ہے
میں بینک اور موبائل میں رہنا پسند کرتا ہوں
دل میں رہنا
ایک بوسیدہ خیال ہے،
اے بوسیدہ خیال لوگو ___

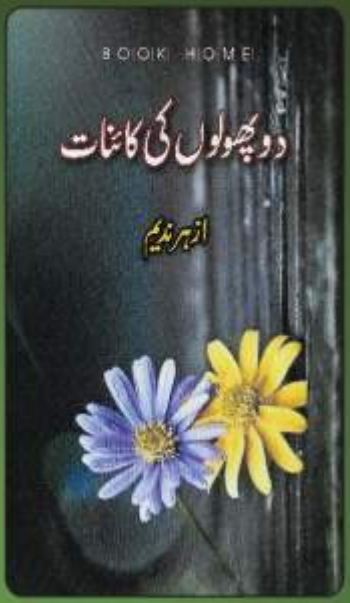

BOOK HOME
دو پھولوں کی کائنات
ازہر ندیم

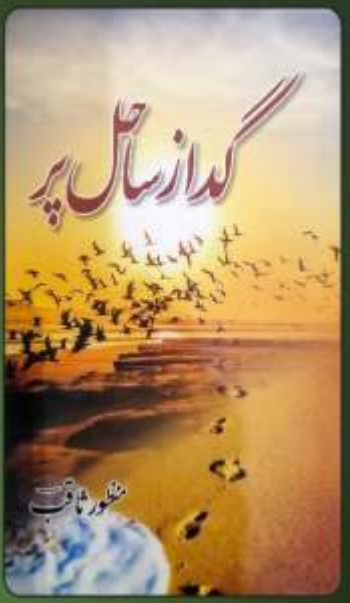

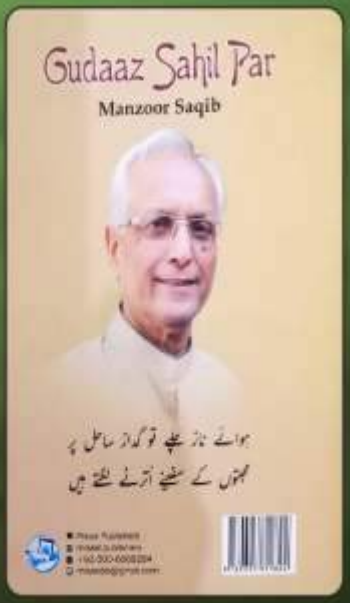

گداز ساحل پر
منظور ثاقب

Gudaaz Sahil Par
Manzoor Saqib

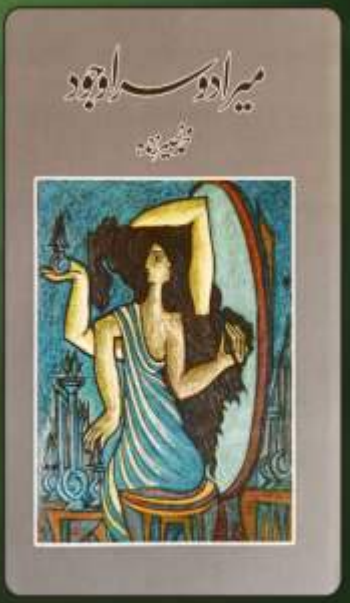

میرا دوسرا وجود

ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد